مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH.

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا —— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۸ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۱ء عدد ۲

مضامین

شذرات

اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کو زیر اور پسپا کرنے کی تدبیریں اور سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری ہیں، ان کے خلاف تمام اسلام دشمن عناصر نے زبردست مہم چلا رکھی ہے، عیسائیوں اور یہودیوں نے انھیں اپنے دام تزویر میں اس طرح پھنسا دیا ہے کہ اس سے نکلنے کے لیے جتنا ہی وہ ہاتھ پیر مارتے ہیں اتنا ہی اس میں مزید پھنستے اور الجھتے جارہے ہیں، انھیں اگر کوئی خوف و خطرہ ہے تو وہ صرف مسلمانوں کی بیداری سے، ان کی عافیت اور خیر اسی میں ہے کہ مسلمان اپنی نشاتِ ثانیہ سے غافل ہوکر ان کے پلائے ہوئے نشہ میں مست و مخمور رہیں، انھیں یقین ہے کہ مسلمانوں نے اگر اپنی شیرازہ بندی اور اصلاح و احتساب کا کام کرلیا تو اسلام کی اثر آفرینی اور کارفرمائی اور مسلمانوں کے غلبہ و تسخیر کو روکنا ناممکن ہو جائے گا ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

ہر جگہ مسلمانوں کو اپنے مخالفین کی انھی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، یہاں تک کہ دنیائے اسلام کا امن و امان بھی شر پسندوں اور طاغوتی قوتوں نے درہم برہم کر رکھا ہے، انھوں نے چار دانگ عالم میں اپنے مکر و فریب کے جو تانے بانے پھیلا رکھے ہیں اس کی بنا پر مسلمان خود ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں، اور ان کی ساری صلاحیت و قوت اپنے حریفوں کے بجائے اپنے ہی بھائیوں سے زور آزمائی میں صرف ہو رہی ہے، یہی اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ مسلمان مسلمان سے نبرد آزما ہیں، اور وہ آپس ہی میں لڑ بھڑ کر اپنے کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، ان کے دشمن مطمئن اور بے فکر ہیں کہ مسلمانوں کو پامال اور پسپا کرنے کا جو کام انھیں انجام دینا چاہیے تھا وہ خود مسلمان ہی کر رہے ہیں، اس لیے اب ان کی تگ و دو کا محور صرف یہ رہ گیا ہے کہ مسلمانوں میں مفاہمت نہ ہونے پائے، ورنہ وہ اپنے اصل دشمنوں کی طرف متوجہ ہوکر ان کی ساری سازشوں کو ناکام بنا دیں گے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی صورت حال اس سے مختلف نہیں ہے، ان کی نسل کشی اور ذہنی ارتداد کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے، سنہ ۴۷ء کے بعد سے مسلسل یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ان کا اختلاف و انتشار ختم نہ ہونے پائے، اور ان کو نت نئے مسائل میں اس طرح الجھا دیا جائے جن سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو، اور جن کے پیچھے ان کے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور قابلیتیں صرف ہوتی رہیں، اور وہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنی تعمیر و ترقی کا کوئی نیا منصوبہ نہ بنا سکیں، اگر کسی معاملہ کے سلجھنے کی تھوڑی بہت امید پیدا ہوتی ہے تو اس سے زیادہ پیچیدہ اور اہم معاملہ ان کے سامنے آجاتا ہے، گزشتہ نصف صدی سے یہی سلسلہ جاری ہے، نہ مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہو رہا ہے اور نہ اس کی پیچیدگی اور دشواری میں کوئی کمی واقع ہو رہی ہے، ہر نیا روز ان کے لیے نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہوتا ہے، اور ان کی شام غم کی سحر پیدا ہونے کے امکانات معدوم ہوتے جارہے ہیں۔

مسلمانوں کا اختلاف و افتراق گھٹنے کے بجائے بڑھتا جارہا ہے، ان کے اندر اتنے فرقے اور گروہ پیدا ہوگئے ہیں جن کے نہ یکجا اور متحد ہونے کا کوئی تصور کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کی دوری اور بُعد کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر آتی ہے، ایک ہی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے وہ سرگرم جد و جہد شروع کرتے ہیں اور اس کے لیے شب و روز ایک کر دیتے ہیں، مگر پھر وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر اپنے اصل مسئلہ سے غافل ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا چکر شروع ہو جاتا ہے، اور باہم یہی ان کا اصلی مسئلہ بن جاتا ہے، مذہبی اور دینی جماعتوں کا فاصلہ اور زیادہ بڑھا ہوا ہے، ان کو دین و ملت کی خدمت کا دعویٰ ہے، مگر دوسرے کی خدمت گوارا نہیں ہے، اس طرح دینی خدمت تو پس پشت ہو جاتی ہے اور باہم ایسی محاذ آرائی اور معرکہ آرائی شروع ہو جاتی ہے جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔

ہندوستان کے مسلمان آخر کب تک اسی سعی لاحاصل میں پڑ کر ناسازگار حالات کا شکوہ، اپنی محرومی کا گلہ اور اپنی مظلومی کا دکھڑا بیان کرتے رہیں گے، اگر انھیں اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کو

ناکام بنا ہے تو مشکلات اور دشواریوں کے باوجود اب انھیں اپنی دینی، ملی اور قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کیلئے نئے سرے سے جدوجہد کرنی ہوگی، اور یہ سوچنا ہوگا کہ وہ اس ملک میں کتنے غیر مؤثر اور بے وزن ہوگئے ہیں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے ان کی پس ماندگی کس قدر بڑھ گئی ہے، سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب کیوں بہت کم ہوگیا ہے، اس وقت اور باتوں سے قطع نظر اگر وہ صرف تعلیم کے مسئلہ کی جانب یکسوئی سے متوجہ ہوجائیں تو اس ملک میں ان کی قدر و قیمت بھی بڑھ جائے گی اور ان کی اقتصادی بدحالی کے ختم ہونے کی صورت بھی پیدا ہوجائے گی، جدید تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی میں برتری نہ حاصل کرنے کی وجہ ہی سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں ادنیٰ درجہ کے شہری ہوگئے ہیں

اس موقع پر مسلمانوں کے زعماء اور ان کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کے سربراہوں سے بھی صفائی کے ساتھ یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے معمولی مفاد اور جماعتی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں کو مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم کرنے سے باز آجائیں مسلمانوں کے اختلاف سے ہمیشہ ان کے دشمنوں کا فائدہ اور خود ان کا نقصان ہوا ہے، اگر انھیں واقعی اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی ہے، اور وہ دینی خدمت کا مخلصانہ جذبہ رکھتے ہیں تو شیرازۂ ملت کو تار تار ہونے سے بچائیں، اور ڈاکٹر اقبال کا یہ دردمندانہ کلام ایک بار پھر گوش عبرت نیوش سے سن لیں ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مقالات

علامہ شبلیؒ اور سیرت نبویؐ کی تالیف
مقدمہ سیرت پر ایک نظر

ضیاء الدین اصلاحی

علامہ شبلیؒ کے علمی، تحقیقی اور تصنیفی کارناموں میں سیرۃ النبی کی تالیف سب سے اہم اور بے مثال ہے جس کی طرف وہ سب سے آخر میں متوجہ ہوئے اور اسی پر ان کا خاتمہ بالخیر ہوا

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

گو وہ اس کی ناکامی کا داغ لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کے قلم سے صرف دو ہی جلدیں پایۂ تکمیل کو پہنچیں لیکن اس کا مکمل خاکہ اور پورا پلان وہ خود تیار کرچکے تھے۔

مولانا شبلیؒ کا مقصد فن سیرت میں ایک ایسی جامع اور محققانہ کتاب مرتب کرنا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، واقعات اور کارنامے بھی مستند طریقے پر بیان کیے گئے ہوں اور آپؐ کے پیغام، آپؐ کی ہدایت و شریعت اور اسلام کی دعوت

دتعلیم کو بھی نہایت صحیح اور مستند ماخذ کی مدد سے موجودہ دور کے مذاق کے مطابق پیش کیا گیا ہو تاکہ اس سے معلوم ہو جائے کہ اسلام کا پیغمبر کون تھا اور وہ دنیا میں کیا لیکر اور کس مقصد سے آیا تھا۔ مولانا شبلیؒ اپنے ایک مکتوب میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت میں آجائیں، یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا۔"[1]

منشی امین زبیری کو تحریر فرمایا:۔

"ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی ہے۔"[2]

ایسی جامع اور مکمل سیرت لکھنے کا خیال اس لیے پیدا ہوا تھا کہ گذشتہ صدی میں مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کی طرح اس کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور مغرب کے نظر فریب تمدن نے انہیں اپنے علوم، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن ہر چیز سے بیگانہ کر دیا تھا اور وہ مغربی تہذیب کی چمک دمک سے اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی تاریخ کا شاندار اور قیمتی اثاثہ اور پیغام محمدی کا تابناک اور لازوال خزانہ بھی اس کے سامنے دھندلا، پھیکا اور ماند نظر آتا تھا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور زیادہ پسپا ہو گئے تھے، اس زمانہ میں ان پر دو سمتوں سے مہیم حملے ہو رہے تھے ایک حملہ عیسائی مشنریوں کا تھا اور

[1] مکاتیب شبلی ج ا ص ۲۶ طبع چہارم مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۶۶ء [2] ایضاً ص ۲۴۲۔

دوسرا مستشرقین یورپ کا، جو نہایت خطرناک تھا، پہلے حملہ کا جواب تو ایک حد تک اس زمانہ کے علما اور بعض نئے تعلیم یافتہ حضرات نے دیا مگر مستشرقین اور فضلائے مغرب نے اپنے حملے میں ایسا علمی اور سائنٹفک انداز اختیار کیا تھا جس کا جواب نہ تو قدیم طرز کے علما دے سکتے تھے اور نہ مغرب سے مرعوب اور دینی علوم سے بے بہرہ نیا طبقہ دے سکتا تھا، مستشرقین نے اسلام کی عمارت کو منہدم کرنے کے لیے سب سے زیادہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو مجروح و مطعون کیا تھا، علامہ شبلیؒ کی نظر اس فتنہ کے تمام گوشوں اور تہوں تک پہنچی ع

مہر ایں فتنہ ز جائے کہ من می دانم۔

اس لیے وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری تیاری کے بعد میدان کارزار میں داخل ہوئے، ان کے زمانہ میں جن اعتراضات کا زیادہ چرچا اور زور تھا مثلاً جزیہ، کتب خانہ اسکندریہ وغیرہ ان کا جواب انھوں نے نہایت مدلل اور محققانہ دیا، اسی سلسلہ میں انہیں سیرت نبویؐ پر بھی ایک مبسوط اور محققانہ کتاب لکھنے کا خیال آیا جس میں وہ سوانح نبویؐ کے ساتھ اسلام کے عقائد و عبادات اور احکام و اعمال کی بھی مکمل تفصیل بیان کرنا چاہتے تھے۔

مولانا شبلیؒ نے اسلام، پیغمبر اسلامؐ، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز اور سلیس و شگفتہ زبان میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا کہ اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے جانے والے اعتراضات کا تار و پود خود بخود بکھر جائے اور معترضین بھی اسلام کی عظمت، صداقت اور حقانیت کو ماننے کے لیے مجبور ہو جائیں۔

سیرت نبویؐ کا یہ عظیم الشان کام صرف ایک مورخ اور اہل قلم نہیں انجام دے سکتا تھا، اس کے لیے مورخانہ دیدہ وری کے ساتھ اسلام اور اسلامی علوم میں گہری بصیرت، قرآن، حدیث اور اسلامی فقہ و قانون میں مبصرانہ نظر، قدیم و جدید فلسفہ اور علم کلام میں مہارت، اسلامی تاریخ میں وسعت نظر، تلاش و تحقیق کے جدید طریقوں، مغربی علوم و افکار اور نئے حالات و رجحانات سے واقفیت بھی ضروری تھی تاکہ سیرۃ النبیؐ صرف سیرت کی کتاب نہ ہو بلکہ جدید علم کلام کی اساس بھی ہو۔

علامہ شبلیؒ کی ذات میں قدرت نے یہ تمام خوبیاں اور خصوصیات جمع کر دی تھیں اس لیے سیرۃ النبیؐ واقعتاً ان کا شاہکار ہے۔ مناسب ہوگا کہ شروع ہی میں اس کی چند نمایاں خصوصیات کو پیش کر دیا جائے۔

۱۔ اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں بھی مجموعی حیثیت سے اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں۔

۲۔ اردو میں سیرت پاک پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں عموماً صرف آپؐ کے سادہ واقعات و حالات زندگی، مغازی، شمائل اور اخلاق کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اور سیرت کی اکثر کتابیں رطب و یابس ہر قسم کی روایات پر مشتمل ہیں، ان میں نہ روایات و واقعات کی تحقیق و تنقید اور ان کی صحت و وثوق پر بحث کی گئی ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے اعتراض و الزام خصوصاً مستشرقین کے بے سروپا اعتراضات کا کوئی جواب دیا گیا ہے، علاوہ ازیں ان کتابوں میں جدید ذوق و رجحان کی رعایت بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، سیرۃ النبیؐ میں پہلی مرتبہ ان سب امور کو مدنظر رکھا گیا ہے اور اس میں عام مباحث کے علاوہ اسلامی تعلیمات کو بھی نہایت

دلنشین اور محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اس اعتبار سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محض سوانح عمری نہیں ہے بلکہ اسلامی دائرۃ المعارف ہے جس میں آپؐ کے پیغام و دعوت، تعلیم و ارشاد اور اسلام کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۳۔ سیرۃ النبیؐ میں سیرت و سوانح اور اسلامی تعلیمات کا اکثر مواد قرآن مجید اور احادیث صحیح سے ماخوذ ہے، اس لیے وہ نہایت معتبر اور مستند ہے، روایات کے رد و قبول میں بڑی چھان بین اور مکمل احتیاط کی گئی ہے اور ان پر بڑی محققانہ و ناقدانہ بحث کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں جو عالمانہ مقدمہ ہے اس میں فن سیرت اور روایت و درایت کے اصول پر ناقدانہ بحث ہے۔

۴۔ اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا مدلل جواب اس میں دیا گیا ہے مگر بحث و مناظرہ کا رنگ نہیں آنے پایا ہے بلکہ نفس واقعہ کو تحقیق و تدقیق کے بعد ایسے موثر اسلوب اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اعتراضات خود بخود رفع ہو گئے ہیں اور جو اعتراضات ناقابل اعتبار روایتوں کی بنا پر کیے گئے تھے وہ بھی ان روایتوں کے نقد و جرح کی کسوٹی پر پورا نہ اترنے کے بعد زائل ہو گئے ہیں، بعض جدید سیرت نگاروں اور نئے متکلمین کی طرح محض اعتراض سے بچنے کے لیے نہ تو صحیح واقعات کا انکار کیا گیا ہے اور نہ ان کی غلط تاویل و توجیہ کی گئی ہے، ہر مبحث میں صحیح نقطہ نظر اور اسلامی طرز فکر کو اپنایا گیا ہے اور قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے اس کی وضاحت کی گئی ہے مگر اس کے لیے نقلی کی طرح عقلی دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو

مغرب کے فضلا اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں بحث و جدال کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ خود انھی کی تحقیقات اور ہتیاروں سے انکی کاٹ کی گئی ہے۔

۵۔ علامہ شبلی اردو کے ممتاز اور مایۂ ناز ادیب و انشا پرداز تھے اس لیے سیرۃ النبیؐ کی زبان نہایت سلیس و شگفتہ اور اسلوب بیان و طرز تحریر بڑا دلکش و دلآویز ہے، دقیق اور پیچیدہ علمی بحثوں کو بھی بڑے موثر اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے اس حیثیت سے اردو کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۶۔ صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کی وجہ سے سیرۃ النبیؐ پر قدیم طرز کے علما کو حرف گیری کا موقع کم ملا، دوسری جانب تلاش و تحقیق کے جدید طریقوں، سلیس زبان، شگفتہ انداز بیان اور دلکش طرز تحریر اختیار کرنے اور نقلی و عقلی دونوں طرح کے دلائل پیش کرنے کی وجہ سے اس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی تشفی کا بھی پورا سامان موجود ہے۔

۷۔ سیرۃ النبیؐ کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی، اس کے درجنوں ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔

طوالت مانع نہ ہوتی تو ہم مولانا شبلیؒ کی تحریر کردہ سیرۃ النبیؐ پر مختلف حیثیتوں سے بحث و گفتگو کرتے، یہاں صرف اس کے مقدمہ کے تحلیلی جائزہ پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس سے اس کی اہمیت و ضرورت، بلند پائیگی، اس کے مقاصد و خصوصیات، اس کے طریقۂ بحث و نظر، اصول ترتیب و تصنیف، عام کتب سیرت کی خامیوں، مولانا شبلیؒ کی حزم و احتیاط، تحقیق و تدقیق اور دیدہ وری و نکتہ آفرینی وغیرہ کا اندازہ کافی حد تک ہو جائے گا۔

مقدمہ کی ابتدا میں سیرت نبویؐ کی تالیف کی ضرورت بیان کی گئی ہے پہلے مقصد تصنیف کا مذہبی پہلو اس طرح بیان کیا ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت ہے جس کا سب سے زیادہ صحیح سب سے زیادہ کامل اور سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن عمل ہو، اب تک دنیا کی تاریخ نے اس قسم کے جو نفوس قدسیہ پیش کیے ہیں ان میں جامع و کامل ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے آپؐ کا کارنامۂ زندگی آپؐ کے بعد بھی پوری صحت اور نہایت وسعت و تفصیل کے ساتھ دنیا میں موجود ہے، آپؐ کے اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی۔

سیرت کی تالیف کا علمی پہلو یہ ہے کہ علوم و فنون میں سیرت کا ایک خاص درجہ ہے، اس کی خاص غرض عبرت پذیری اور نتیجہ رسی ہے، اس لیے صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے جس کا نام مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، مولانا شبلیؒ کے الفاظ میں:۔

"یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے، اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔"

اس زمانہ میں علم کلام کی حیثیت سے بھی سیرت کی ضرورت ہے جبکہ اگلے زمانہ میں اس کی ضرورت تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی کیونکہ جب

اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کی بحث پیش آتی ہے۔ یورپ کے مورخین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں اس سے وہ ہر قسم کے معائب کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے، آج کل جو مسلمان عربی علوم سے محروم ہیں ان کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات و سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو یورپ کی انہی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہرآلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبرؐ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے ہیں۔

مولانا شبلیؒ ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"سیرۃ نبویؐ کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہو گا۔ یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی اس لیے اس کو چار و ناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے ۔۔۔

قوم کی طرف سے ایک مدت سے تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبویؐ کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں، خود میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں"۔ (مقالات شبلی جلد ۸، صـ۳۳)

مولانا مذہبی حیثیت سے اپنا فرض اولین سمجھتے تھے کہ تمام تصنیفات سے پہلے سیرت نبویؐ کی خدمت انجام دیں لیکن یہ ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ ایک مدت تک اس کو ادا کرنے کی ہمت و جرأت نہ کر سکے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ اس فرض کو ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں تو بالآخر مجبور ہوئے اور انھوں نے سیرت نبویؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

سیرت نبویؐ کی تالیف کی ضرورت واضح کرنے کے بعد انھوں نے اس کے قدیم ذخیرہ کی مختصر تاریخ اور کیفیت اس لیے درج کی ہے کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لیے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک اس میں تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے ۔

مولانا شبلیؒ مسلمانوں کے فن سیرت کے بلند معیار و اصول کا ذکر کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ سیرت نبویؐ کے واقعات تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد قلمبند ہوئے اس لیے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں، دوسری قوموں کے یہاں جب کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا اور ان افواہوں میں وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی

اصول پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے فن سیرت کا معیار اس سے بہت زیادہ بلند ہے اور یہاں دو اصولوں پر مبنی ہے۔

پہلا اصول روایت کا ہے، مولانا شبلیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک کے تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون کون تھے؟ کیسے تھے، کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عاقل تھے یا جاہل؟

ظاہر ہے ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا مگر مولانا فرماتے ہیں کہ سیکڑوں ہزاروں محدثین نے اسی کام میں اپنی عمریں صرف کر دیں، ان کی تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

مصنف نے راویوں کی جرح و تعدیل اور فن رجال کی ممتاز تصنیفات کا ذکر کرنے کے بعد بتایا ہے کہ اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ
فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا (حجرات ۱)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق
خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

اور حدیث ذیل کو بھی اس کی بنیاد بتایا ہے۔

کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ
بِکُلِّ مَا سَمِعَ

آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی
دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کرے۔

ان کے نزدیک تحقیق واقعات کا دوسرا اصول درایت ہے یعنی جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں وہ اس اصول کا ماخذ بھی قرآن مجید ہی کو بتاتے ہیں، حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ میں آ گئے، قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْکِ
عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ (نور-۲)

جن لوگوں نے تہمت لگائی،
وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برأت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ
لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِھٰذَا سُبْحٰنَکَ
ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (نور-۲)

اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں
کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب
نہیں، سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کیے جاتے پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایت ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہیے کہ غلط ہے۔

مولانا شبلیؒ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس طرز تحقیق کی ابتدا خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی، حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے یہ مسئلہ بیان کیا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایت نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی اس لیے انھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہوگی۔

محدثین نے درایت کے جو اصول منضبط کیے ہیں، مولانا نے اس موقع پر ان کا ماحصل پیش کیا ہے جس کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

سیرت کی اجمالی اور سادہ تاریخ بیان کرنے کے بعد کتب سیرت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں کیا خامیاں رہ گئی ہیں اور مولانا شبلیؒ نے ان کے اصلاح و تدارک کی جو کوشش کی ہے وہ بھی سامنے آجاتی ہے، اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ سیرت پر سیکڑوں کتابیں موجود ہیں، مگر سب کا مرجع چار کتابیں ہیں سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، اور طبری، مولانا شبلیؒ واقدی کو بالکل نظر انداز کرنے کے قابل بتاتے ہیں اور اس کے وجوہ مقدمہ میں کئی جگہ انھوں نے لکھے ہیں، باقی تین مصنفین کو قابل اعتبار قرار دیتے ہیں مگر ان لوگوں کا مستند ہونا مولانا کے نزدیک ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا کیونکہ یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں اوروں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں اس کی کسی قدر تفصیل بیان کرنے کے

بعد وہ یہ تبصرہ کرتے ہیں:۔

"اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔" (ص۴۹)

سیرت کی کتابوں کی کم پائیگی کی چند وجہیں بتاتے ہیں:۔

۱۔ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی اور جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں سمجھی گئی، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں سیرت منظوم کے دیباچہ میں فرماتے ہیں "طالب کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں سب ہی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں صحیح بھی اور غلط بھی" مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہوگئیں اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کو درج کرنا جائز رکھا، اس کی تائید میں علامہ ابن تیمیہؒ کے اقوال نقل کر کے بتاتے ہیں کہ ابونعیم خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث و روایت کے امام تھے باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

مولانا شبلیؒ اس قابل لحاظ نکتہ کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ حدیث و روایت

میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزار، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرہ طبریہ خشک ہوگیا، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

مولانا شبلیؒ کا خیال ہے کہ سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اس لیے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہوگئیں اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا نے اس امر کی بھی نشاندہی کی ہے کہ سیرت کی روایتوں میں محدثین کے اصول اکثر نظر انداز ہوگئے ہیں ان کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں اکثر منقطع ہیں، صحابہؓ میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت روایت

کے قابل ہو سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اس بنا پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں۔

۲۔ دوسری وجہ تصانیف سیرت میں کتب احادیث کی طرف سے بے اعتنائی ہے جو مولانا شبلیؒ کے نزدیک نہایت تعجب انگیز ہے، جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا چنانچہ بعض اہم واقعات کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان کا ذکر نہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا کی لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن ابی کو یہ خط لکھا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے ان کو نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں کا استیصال کر دیں گے، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

۳۔ تیسری وجہ مصنفین سیرت کی تدلیس بتائی ہے، سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کی ہیں انہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا اور چونکہ

اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں اس لیے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہوگئیں، اس تدلیس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں لیکن انہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ انکو معتبر سمجھتے ہیں حالانکہ ابن سعد کی اصل کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ روایت کے جو اصول منضبط ہوئے صحابہؓ کے متعلق ان سے بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی آدمی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ پر اسی بنا پر تنقیدیں کیں۔

مولانا شبلیؒ بتاتے ہیں کہ اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے مثلاً دو روایتوں میں تعارض کے وقت بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا لیکن صحابہؓ میں اگر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے، ایک روایت

حضرت عمرؓ سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تھا تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، مشہور محدث علامہ مازری نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی مگر مولانا شبلیؒ عام محدثین کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے مازری کے قول کی مخالفت کی ہے، مولانا شبلیؒ کے نزدیک انھوں نے بے شبہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہؓ سے مخصوص کر دیا اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے بیجا نہیں لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصیت سے وہ ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنے پر زور دیتے ہیں جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔ (باقی)

سلسلہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبیؐ ہے، مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اس کتاب کے سات حصے شائع ہوئے ہیں، جن کی قیمت حسب ذیل ہے:۔

حصہ اول:۔ ۶۵ روپیے حصہ دوم:۔ ۵۰ روپیے حصہ سوم ۱۲۵ روپیے

حصہ چہارم:۔ ۱۲۵ روپیے حصہ پنجم:۔ ۶۰ روپیے حصہ ششم:۔ ۱۲۵ روپیے

حصہ ہفتم:۔ زیر طبع

"منیجر"

اُردو کی مناجاتی شاعری

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط۔

"دعاء" دراصل رفع احتیاج کے لیے خدائے برتر کے آگے نہایت بیچارگی کی حالت میں ہاتھ پھیلا کر طالب استعانت ہوتا ہے۔ انسان بالطبع عبدیت و عبودیت کا خوگر ہے۔ وہ جب مشکلات اور پریشانیوں میں گھر جاتا ہے اور ان سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی تو اپنے دل وافتقار کا اعتراف کرتے ہوئے خالق حقیقی سے مدد و نصرت کی درخواست کرتا ہے۔ وہ مالک کائنات کی بندگی کر کے اپنے بندہ و غلام ہونے کا عملاً اقرار کرتا ہے۔ عبدیت کے اس شعور کو انسانیت کی تاریخ کی ابتدا سے لیکر آج کے متمدن دور تک علم و حکمت کے مختلف النوع اکتشافات اور حیاتیات و علم الاجسام کے حیرت ناک تجربات بھی انسان کے اذہان سے مٹا نہیں سکے۔ اس لیے جب بھی لاینحل و لاحل مسائل درپیش آتے ہیں تو عالم وارفتگی میں غایت آہ و زاری کے ساتھ بندہ اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندے کی تضرع و زاری کی یہ حالت دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تضرع کی ایسی حالت ہی بندے کے انبساط و سرور کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سکینہ سے اس کا قلب معمور ہو جاتا ہے افکار و آلام و وساوس سے وہ مستغنی ہو جاتا ہے اور اللہ کی ذات اس کے لیے معین

و معاون اور محافظ و مستجیب بن جاتی ہے۔ گویا اللہ کے مائل بہ کرم ہونے کے لیے بندے کی عاجزی و انکساری اور اضطرار و اضطراب شرط ہے۔

دعا کی تاکید

"دعاء" اللہ کا حکم بھی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے۔

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (الاعراف ۵۵)
اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔

ایک جگہ اللہ رب العزت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے عام لوگوں کو متنبہ کر رہے ہیں۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (الفرقان آیت ۷۷)
(کہدو (اے محمدؐ) میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے۔

اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن آیت ۶۰)
مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔

دعا کی اس اہمیت کے پیش نظر ہی آنحضورؐ نے بھی اس کی بار بار رغبت دلائی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

ان الدعاء ینفع مما نزل و مما لم ینزل فعلیکم عباد اللہ بالدعاء (ترمذی مسند احمد)
یعنی دعاء ہر حال نافع ہے ان بلاؤں کے معاملے میں جو نازل ہو چکی ہیں اور انکے معاملے میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں پس اے بندگان خدا!

تم ضرور دعا مانگا کرو۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

یسأل احدکم ربه حاجته	تم میں سے ہر شخص کو اپنی حاجت
کله حتی یسأل شسع نعله اذا	خدا سے مانگنی چاہیے حتیٰ کہ اگر
انقطع (ترمذی)	اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے
	تو خدا سے دعا کرے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کی نگاہ میں مکرم یا باوقعت نہیں ہے۔ ایک بار آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔ (ترمذی) کبھی تو ترغیبی انداز میں آپؐ نے فرمایا کہ "دعا عین عبادت ہے"۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی) نیز دعا عبادت کا مغز ہے (ترمذی) ایک جگہ ترہیبی انداز میں آپؐ نے فرمایا۔ "قضا کو بجز دعا کوئی چیز نہیں ٹال سکتی۔ (ترمذی)

اس طرح قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحیہ سے صراحتاً دعا کی اہمیت، سودمندی اور اللہ کے نزدیک اس کی وقعت و رفعت واضح ہوتی ہے۔ پس بندے کو چاہیے کہ بارگاہِ ایزدی میں وہ اپنے احتیاجات کو رفع کرنے کے لیے دعا مانگا کرے کہ یہی عمل اللہ کی آقائی کا اعتراف اور بندے کی درماندگی کا اقرار ہے۔ بندے کی انابت و رجوع الی اللہ والی کیفیت اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ عمل اگرچہ بظاہر غایت تذلل کا مظہر ہے لیکن الحمدللہ

عزت نفس مومن کے عین مطابق ہے۔ یہی عمل اللہ جل شانہٗ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر کتب مقدسہ وصحائف متبرکہ کی ابتدا دعا ہی سے ہوتی ہے یا ان میں دعاؤں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم اولیتا اور وید وا پنشد کی ابتدا میں دعاؤں کا التزام ہے۔ قرآن کی ابتدا سورۃ الفاتحہ سے ہوتی ہے جسے "سبع المثانی" (یعنی سات دہرائی جانے والی) کہا جاتا ہے۔ احادیث میں اسی سورت کو "ام القرآن"، "اساس القرآن"، "الکافیۃ" اور "الکنز" وغیرہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسے "دعاء" کہا ہے (تفہیم القرآن جلد اول ص ۴۲) سورۃ الفاتحہ کے اعجاز وایجاز نیز عدیم المثال اور غیر مبہم معنویت کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مرتب یوں گوہر افشانی کرتا ہے:۔

"سورۂ فاتحہ حمد باری ہے۔ یہ زبردست مناجات ہے۔ سلیس اتنی کہ مزید تشریح سے بے نیاز مگر اس پر بھی معنویت سے لبریز۔"[2]

ایک اور آسمانی کتاب "زبور" میں بھی حضرت داؤد علیہ السلام کی دعا ومناجات بڑی پُراثر اور رقت انگیز ہے۔ اس کے کئی منثور و منظوم تراجم عربی۔ فارسی۔ اردو میں ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں وید وا پنشد میں بھی ابتدائے دعائیہ کلمات "سوکت" کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کی دعاؤں میں بندے کے احساس عجز کے ساتھ آقائے رب السمٰوٰت والارض کی شان قدرت کا

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن؛ دہلی۔ ۱۳۵۰ھ جلد اول ص ۲ [2] بحوالہ ریاض ڈیلی "اشاعت اردو" ریاض عرب امارات مورخہ ۱۴ جون ۱۹۹۰ء

برملا اظہار ہوا ہے۔ غالباً ان ہی نمونوں کو سامنے رکھ کر ادب عالیہ پر مشتمل بیشتر کتابوں کی ابتدا حمد و مناجات سے کی گئی ہے۔ چنانچہ عربی ادب میں کئی بہترین مناجاتوں کا سراغ ملتا ہے۔

عربی شاعری میں دعا و مناجات

حضرت حسان بن ثابت الانصاریؓ نعت رسولؐ میں ہمیشہ رطب اللسان رہتے تھے۔ حمد و مناجات میں ان کی عقیدت کی گہرائی اور دل سوزی کی کیفیت مومنانہ شان کی حامل ہے۔ ان کی نعتوں میں برمحل مناجاتی اشعار بھی آجاتے ہیں۔ دیکھیے ایک شعر میں "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کی توضیح کتنے سلیقہ سے کی گئی ہے۔

لك الخلق والنعماء والامر كله	فاياك نستهدي واياك نعبد[عسه]

(مفہوم) حیات بخشی اور نفع رسانی اور ساری حکمرانی صرف تیری (اللہ کی) ہے۔ ہم تجھ سے ہدایت کے طالب ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

ایک اور مناجات خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منسوب ہے۔ اسمیں بندے کے احساس عجز کو گویا الفاظ کی شکل دے دی گئی ہے۔ اللہ کی مدد و نصرت کے بغیر بندہ باوجود با اختیار ہونے کے کتنا بے اختیار دکھائی دیتا ہے۔ ذیل کی مناجات میں انہی کیفیات کی عکاسی ہوئی ہے۔

خذ بلطفك يا الهي من له زاد قليل	مفلس بالصدق ياتي عند بابك يا جليل
كيف حالي يا الهي ليس لي خير العمل	سوء اعمالي كثير زادطاعاتي قليل
طال يا ربي ذنوبي مثل رمل لا تعد	فاعف عني كل ذنب فاصفح الجميل
رب هب لي كنز فضل انت وهاب كريم	اعطني ما في ضميري دلني خير الدليل

عسه ماخوذ از عربی میں نعتیہ کلام: عبداللہ عباس ندوی لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۶۶۔

(ترجمہ) اے خدائے پاک! جس کے پاس توشۂ آخرت بہت کم ہے اپنے لطف و کرم سے اسے نواز۔ اے مولائے جلیل! مفلس سچائی کے ساتھ تیرے در پر آرہا ہے، یا رب الٰہا! میرا کیا حال ہوگا؟ میرے پاس تو عمل کی پونجی نہیں۔ برے اعمال زیادہ ہیں، عبادت کا توشہ بہت کم ہے۔ اے میرے رب میرے گناہ ریت کی طرح بے شمار ہیں۔ ہر گنہ معاف کیجئے اور خوشگوار طریقہ سے درگذر فرمائیے۔ اے میرے رب! مجھے اپنے فضل کا خزانہ عطا کیجئے آپ بڑے داتا اور کریم ہیں۔ جو میرے دل میں ہے عنایت کیجئے اور بہترین رہنمائی فرمائیے۔

مناجات میں رقت انگیزی اور تضرع کی ایسی کیفیات ہمیں جدید عربی شعرا کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ تحریک "العصبة الاندلسية" کے شعرا کا نصب العین اگرچہ فطرت و حیات کے حسن و جمال سے ادب کو حسین و جمیل بنانا ہے، لیکن بارگاہِ الٰہی میں دعا کے وقت احساس حسن و جمال سراسر احساس بیچارگی میں بدل جاتا ہے ایلیا ابو ماضی کے یہ مناجاتی اشعار ملاحظہ ہوں:-

وليس حالي يا رب داء	ولا احتياجي الى الدواء
لكن امنيتي بنفسي	يسترها الخوف والحياء
نقلت! يا رب فصل صيف	في أرض لبنان او شتاء
فانني ههنا غريب	وليس في غربة هناء[1]

(ترجمہ) اے میرے رب! نہ مجھے کوئی مرض ہے اور نہ مجھے دوا کی ضرورت ہے۔

[1] جدید عربی ادب کے رجحانات۔ لکھنؤ ۱۹۷۲ء ص ۷۹۔

لیکن میری آرزو میرے جی میں ہے جس کو خوف و شرم چھپائے ہوئے ہے،
تب میں نے کہا اے رب! لبنان میں جاڑا یا گرمی کا موسم چاہتا ہوں۔ اس لیے
کہ میں یہاں اجنبی ہوں اور اجنبیت میں لطف کہاں ؟

فارسی میں مناجات

فارسی شاعری میں مناجات کی عام فضا ہے۔ فردوسیؔ اور عطارؔ سے پہلے بھی فارسی شاعری میں مناجاتوں کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً اویسا اور اس قبیل کی قدیم کتابوں میں مناجاتوں کا بحسن و خوبی التزام کیا گیا ہے لیکن بحیثیت جزو مثنوی مناجات سب سے پہلے شیخ فریدالدین عطارؔ (م۔ ۱۲۳۰ء) کے یہاں ملتی ہے، چنانچہ ان کی مشہور تصنیف "منطق الطیر" کی ابتدا حمد و مناجات ہی سے کی گئی ہے، فردوسیؔ کے شاہنامے میں بھی مناجاتی عنصر مل جاتے ہیں۔ مولانا رومیؔ کی مثنوی میں تو مناجاتی اشعار جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ حکایتوں کے ضمن میں بھی ان کے یہاں مناجاتی اشعار ملتے ہیں۔ ایک جگہ رومیؔ بارگاہ الٰہی میں حمد و مناجات پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خود ثنا گفتن ز من ترک ثنا ست   کیں دلیل ہستی و ہستی خطا ست
اے خدا از فضل تو حاجت روا   با تو یاد ہیچ کس نبود روا [1]

شیخ سعدیؔ کی "بوستان" کا باب دہم تو مناجات ہی کے لیے وقف ہے۔ ان کی مشہور و معروف مناجات "کریما"، تو زبان بر عام و خاص ہے۔

کریما بہ بخشائے بر حال ما   کہ ہستم اسیر کمند ہوا
نداریم غیر از تو فریاد رس   توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

[1] مولانا رومیؔ (مرتبہ تلمذ حسین) مرآۃ المثنوی حیدرآباد ۱۹۳۲ء ص ۵۴۳۔

نگہدار ما را ز راہ خطا   خطا در گذار و صوابم نما [1]

"بوستان" میں سعدیؔ نے اپنی ذات و کائنات کے احتیاجات کی رفع رسانی دنیاوی پریشانیوں اور دکھوں کے دائمی مداوا کے لیے خدا سے رجوع کیا ہے اور آخر میں اپنی 'لاج' رکھ لینے کی دعا کی ہے۔ عزت نفس کے لیے بارگاہ الٰہی میں عجز اور تضرع کی ایسی کیفیت کسی دوسری مناجات میں بہ مشکل ہی مل سکے گی۔

مرا شرمساری بہ روئے تو بس   دگر شرمساری مکن پیش کس

خسروؔ نظامیؔ خاقانیؔ، قدسیؔ وغیرہ نے بھی جو مناجاتیں لکھی ہیں ان میں حد درجہ نیاز مندی و انکساری دکھائی دیتی ہے، لیکن اثر آفرینی کے لحاظ سے عراقیؔ کی مناجاتیں بے مثال ہیں۔ ایسا موثر اور لطیف پیرایۂ بیان رسمی مناجاتوں میں اکثر مفقود ہوتا ہے۔

راہ باریک ست و شب تاریک و مرکب لنگ و پیر   اے سعادت رخ نمائی و اے عنایت دستگیر
ز آفتاب مہر خود حمد مرا نورے ببخش   تا چو ذرہ در فضائے حمد تو یابم مسیر
کے بود کز نور تو روشن شود تیرہ دلم   کے برون آید شب بیچارۂ خوار حقیر
از ہوائے خود بفریادم، اغثنی یا مغیث   در پناہ لطف افتادم، اجرنی یا مجیر [2]

عنایت الٰہی سے دستگیری کے لیے کی ہوئی عراقیؔ کی دعا کے ان اشعار میں بلا کی عاجزی و دردمندی ہے، معنویت پر شاعر کا عجز یہ بیان چھا گیا ہے۔

سرزمین ہند میں ایرانی شعری روایات کو فروغ دینے میں غالبؔ انیسویں صدی میں یکہ و تنہا نظر آتے ہیں لیکن اپنی افتاد طبع، شوخیانہ طبیعت اور قلندرانہ

[1] شیخ سعدیؔ (مرتبہ مختار علی بن محمد علی) "کریما" دیوبند ص ۲ [2] عراقیؔ (مرتبہ سعید نفیسی) "کلیات عراقی" تہران ۱۳۳۸ش ص ۸۲۔

مزاج سے انھوں نے "مناجات" میں بھی "ہنگامہ" کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور شوخیِ بیان کا رس مناجاتوں میں ایسا گھولا ہے کہ وہ ذل وافتقار کے اظہار کے بجائے جرأت وافتخار کا دفتر نظر آتی ہیں۔ اسی لیے غالب کی بیشتر مناجاتیں بے جان جسم بن کر رہ گئی ہیں۔ مناجات کی اصل خصوصیت تو اس کا عاجزانہ و گدایانہ انداز ہے۔ ہنگامہ خیزی اور احتجاج پروری اس کا شیوہ نہیں۔ عاجزی مناجات کی روح ہوتی ہے اور تحیر و درماندگی اس کا حسن۔ عجز و درماندگی سے معرّا دعا، دعا ہی نہیں ہوتی۔ ایسی دعا کو ہم "شکوہ" کہہ سکتے ہیں۔ "دعا" اور "شکوہ" دو علیحدہ الفاظ ہی نہیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پس جس دعا میں "شکوہ"، "تکرار"، اور "احتجاج" ہو وہ بھلا دعا کیسے ہوگی۔ ایسے مناجاتی اشعار میں چاہے کتنا ہی طمطراق اور شعری حسن و جمال ہو مناجاتی شاعری میں وہ بے قیمت ہیں۔ البتہ قصائد میں بادشاہوں (ممدوحین) سے "مانگنے" کے لیے یہ طریقہ مستحسن ہو سکتا ہے، شاہوں کے "داتا" کی بارگاہ میں ایسی جرأت مندی ناروا اور موجبِ خسران ہے۔ بہرکیف! فارسی شاعری میں اثر آفرینی کے لحاظ سے نہایت عمدہ مناجاتیں ہیں۔ انکے علاوہ غزلیات کے بعض اشعار بھی مناجات کے دائرے میں آتے ہیں، جن میں شعرا خدا سے مخاطب ہو کر اپنی داستانِ غم سناتے ہیں اور "اُس" دردِ لاعلاج کے لیے خدائے برتر سے رجوع ہوتے ہیں۔ ایسے مناجاتی اشعار میں بالعموم معشوق کی بے پروائی اور اوروں کے ستم ڈھانے کا تذکرہ ہوتا ہے۔

اردو میں دعا و مناجات

مناجات کا یہ عربی۔ فارسی انداز اردو شعرا نے بعینہٖ اپنایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں مقامی اثرات اور اردو کا اپنا

مخصوص انداز بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اردو کی بعض مناجاتیں حدود شریعت کے اندر نہیں رہ گئی ہیں۔

اردو کی مناجاتی شاعری میدان تحقیق و تنقید میں قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے تاحال اس پر غور و فکر کے دروازے بند ہی رہے۔ بر سبیل تذکرہ کہیں کہیں اس کا ذکر ہو جاتا ہے، جس میں نہ دلائل کی تفصیل ہوتی ہے نہ گہرائی فکر۔ اس مضمون میں اس کی تلافی کی ایک حقیر کوشش کی گئی ہے اور اردو ادب کی ابتدا سے موجودہ دور تک کی مناجاتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو میں مناجات بحیثیت صنف بہت کم برتی گئی ہے، لیکن مثنوی کے ترکیبی عنصر کے لحاظ سے اردو مثنوی میں اس کا استعمال عام ہے۔ بعض ایسی مناجاتیں بھی اردو میں ملتی ہیں جو مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شمالی ہند کے شعرائے متقدمین میں فائزؔ دہلوی کی مناجات اور شعرائے متوسطین میں قائم چاندپوری کی مثنوی مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات وغیرہ اسی قبیل کی مناجاتیں ہیں۔ فائزؔ کی مناجات کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدایا! فضل کر تو بے کساں پر — کرم یا رحم کر تو عاجزاں پر

خدایا! تو حقیقی پادشاہ ہے — مجازی پادشہ تیرا گدا ہے

نہیں ہم کو وسیلہ اور اے حق! — سبھوں کا ہے توہی رزاق مطلق

کہ میں غرق گنہ سرتا بپا ہوں — اسیر نفس کافر ماجرا ہوں

ولیکن تو ہے غفار اے خداوند — کرم میں تجھ نہیں ہے مثل و مانند[1]

---

[1] فائزؔ دہلوی (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی) "دیوان فائزؔ"، دہلی ۱۹۶۵ء ص ۲۲۳-۲۴-۲۵۔

مندرجہ بالا اشعار ایک عاجز بندے کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ گنہ کا اعتراف اور ذاتِ باری سے رحم و ستاری کی امید، بندۂ مضطر کی ایسی بے کسی کو دیکھ کر ہی اللہ رب العزت کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے اور پھر وہ ساری عنایات اس بندے پر نچھاور کر دی جاتی ہیں جن کی اس کو توقع ہوتی ہے۔ وسائل و اسباب پر بندے کا بھروسہ اللہ کو ناراض کرنے کا سبب بن جاتا ہے، ایسے بندے کی صدا بارگاہِ ایزدی میں سنی نہیں جاتی۔ اس کا اللہ کے ساتھ حسن ظن ہی موجبِ استجابتِ دعا بن جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ بندے کے حق میں اس دعا کا اثر مناسب موقع پر ہی ظاہر کرے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "اللہ بندے کی دعا سن کر یا تو اسی وقت شرفِ قبولیت بخشتا ہے یا پھر بجائے اس کے بندے کے حسب حال کوئی دوسری چیز عطا کر دیتا ہے یا نہیں تو آخرت میں اس دعا کا اجر دیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں مانگی ہوئی بندے کی دعا کا اجر بندہ جب آخرت میں دیکھے گا تو حسرت کرے گا کہ کاش میری ساری دعاؤں کا اجر آخرت ہی میں ملتا۔" فائز نے اس مناجات میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے درگذر کا معاملہ فرمانے کی التجا کی ہے، کیونکہ خدا کا مواخذہ نہایت سخت ہوگا۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۔ پس بندے کی یہی امید و بیم والی کیفیت اللہ کو مطلوب ہے۔ "اسیرِ نفس" اور "سرتاپا غرقِ گنہ" ہونے پر خوفِ خدا لیکن ساتھ ہی مولائے کریم کے رحم و کرم کی امید یہی تو مناجات کے موضوعات ہیں۔ اس سے ہٹ کر باغیانہ روش، گستاخانہ لب و لہجہ، شکوہ و شکایت، بے جا ہٹ دھرمی نیز طنز و استہزا مناجات کے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ اس قسم کی

مناجات بندے کی بے غیرتی پر محمول کی جائے گی۔ کیونکہ مناجات کے لیے سلیقہ شعاری تضرع و انکساری ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر غالب اور اقبال کے وہ اشعار جن میں بے باکانہ انداز میں "اپنے ناکردہ گناہوں کی حسرت پہ داد خواہی کی گئی ہے" اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں "تو بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کرنے" کا دعویٰ کیا گیا ہے مناجات کے دائرے میں نہیں لیے جا سکتے۔ مناجات میں تو بندے کی زاری بارگاہِ قدس میں توجہ کا ذریعہ بن سکتی ہے اور یہ بھی اس وقت ممکن ہے جب بندہ ناکردہ گناہوں کی حسرت کے بجائے اپنے کردہ گناہوں پر منفعل ہو اور اپنی سیہ کاری کی بدولت "کعبہ جانے میں بھی اسے شرم محسوس ہو" تو ایسی ندامت پر "شانِ کریمی" بندے کے "قطرۂ انفعالی" "موتی سمجھ کر چن لے گی"۔

مثنوی کے علاوہ اردو قصائد کی تشبیب میں بھی مناجاتی عنصر دکھائی دیتا ہے فرمانروائے بیجاپور علی عادل شاہ ثانی شاہی (م ۱۶۷۲ء) نے تو حمدیہ قصیدے کے دعائیہ حصہ کو مناجات کے لیے وقف کر دیا ہے۔ قصائد میں اکثر ممدوح کی ستائش کرنے میں "صلہ کی تمنا چھپی ہوتی ہے اور آخر میں شاعر دعا دے کر اس تمنا کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ اس قسم کی دعائیں دنیا کے شاہوں کو تو "دی" جا سکتی ہیں، لیکن شاہوں کے شاہ مالک الملک الٰہ العٰلمین کی ثناخوانی کے بعد اس کی بارگاہ میں دعا "مانگی" جاتی ہے۔ دعا دونوں قصائد میں موجود ہے۔ دونوں جگہوں پر دعا کا مقام بھی وہی ہے۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ شاہی قصائد میں شاعر بادشاہ کو "دعا" دیتا ہے۔ اور حمدیہ قصائد میں شاعر "دعا مانگتا ہے"۔ شاہی کے حمدیہ قصیدے میں دعا مانگی گئی ہے۔ یہاں مناجات کی خصوصیت یہ ہے کہ تشبیب کے بعد گریز اور

پھر ثنائے خداوندی۔ اس کے بعد شاعر نے مدح سے دعا کی طرف آنے کے لیے دوبارہ گریز کا ایک شعر استعمال کیا ہے۔

شاہی عاشق آیا بول مناجات کچ ۔۔۔ تا کہ کرم تج پر ہوئے بہر حسین و حسن[1]

گریز کے اس شعر کے بعد شاہی بارگاہِ ایزدی میں یوں دعا گو ہوتے ہیں۔

کارِ جہاں کے سگل فکر تے بھاری اچھے ۔۔۔ سائیں کرے لوبھ جیب دور ہو جائے محن
آہ و افسوس کے تج تے محفوظ دھر ۔۔۔ سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں رکھ مج بدن[2]

اسبابِ دنیا حاصل ہونے کے باوجود شاہی کا مالک الملک کی بارگاہ میں دنیاوی آفات و آلام اور رنج و محن سے خلاصی کی طلب یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کو بھی خدائے عز و جل کے در کی گدائی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ سلاطین کے ذکر کی تقریب کی وجہ سے تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر دو۔ ایک مثالیں اور دی جاتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ سلطان گولکنڈہ بڑا مذہبی اور رعایا پرور شخص تھا۔ شاہی تزک و احتشام، عیش کوشی اور تعیش پسندی نے اسے ملک و رعایا کے حالات سے کبھی بھی غافل نہیں رکھا۔ وہ بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہے کہ "خدایا! میرے ملک کو رعایا سے معمور رکھ اور مجھے رنج و غم اور انکار و آلام سے مستغنی کر دے۔

مناجات میرا تو سن یا سمیع ۔۔۔ منجے خوش توں رکھ رات دن یا سمیع
میرا شہر لوگاں سوں معمور رکھ ۔۔۔ رکھیا جوں توں دریا میں مِن یا سمیع
مرادات کا جم ترنگ سار قطب ۔۔۔ اوسے ساہمت دے اجن یا سمیع[3]

[1]، [2] شاہی (مرتبہ زینت ساجدہ) "کلیات شاہی": حیدرآباد ۱۹۶۲ء ص ۴ [3] قلی قطب شاہ (مرتبہ زور مرحوم) "کلیات قلی قطب شاہ" حیدرآباد ۱۹۴۰ء حصہ اول ص ۶۔

شاعر یہ بھی کہہ رہا ہے کہ جس طرح دریاؤں میں مچھلیاں خوش و خرم محوِ خرام ہوتی ہیں اسی طرح میرے ملک میں رعایا کو رکھ۔ لدے ہوئے گھوڑے کی مانند قطب بھی مرادوں سے لدا ہوا ہے۔ اس لیے اُجُن (اور بھی) اسے ہمت و استقلال نصیب کر اے خدا۔ قدیم مناجاتوں میں فکرِ ذات کے ساتھ فکرِ کائنات کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں لیکن قلی قطب شاہ اپنی مناجات میں اپنے ساتھ اپنی رعایا کے لیے بھی دست دعا دراز کرتے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (جگت گرو) کے دواوین میں بھی مناجاتیں ملتی ہیں۔ آخر الذکر کی کتاب "نورس" کی مناجاتوں میں دیومالا اور صنمیاتی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ سلاطین ہند میں سب سے بدنصیب، یاس و حرماں میں گھرا ہوا بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہے۔ اس کی نوا میں سوز اور ناامیدی کا گہرا رنگ ہے۔ حزن و ملال سے پُر وہ اپنی آہیں جب بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہے تو دعا میں افسردگی اور یاسیت کی جھلک صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا ۔۔۔ یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کیلئے گرچہ بنایا ہوتا ۔۔۔ کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا[1]

اسطرح اردو کی مناجاتی شاعری میں وقت کے سلطان بھی کشکول تمنا لیے ہوئے درِ اللہ پر فقیرانہ صدا لگاتے ہیں۔

امرا و سلاطین کے دربار جس طرح مناجات کی دھنوں سے گونجتے ہیں، اسی طرح خانقاہوں کے در و دیوار سے بھی بے نوا فقیروں کی صدائے مناجات بلند ہوتی ہے۔

[1] بہادر شاہ ظفر (مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی) "نوائے ظفر" علی گڑھ ۱۹۵۸ء ص ۶۴۔

قدیم اردو ادب کو پروان چڑھانے والے صوفیائے کرام میں میرانجی شمس العشاق (م ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء) نے جہاں رشد و ہدایت کا کام سنبھال کر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کام کو آگے بڑھایا وہاں اردو کی نشو و نما کے لیے عوامی زبان میں دعوت دین عوام تک پہنچائی۔ انھوں نے تصوف کے رموز و اسرار اور شرعی احکام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے سیدھی سادی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اسی لیے انکے انداز بیان، اسلوب و طرز میں عامیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بات کو شعر میں بیان کرنے کی بس ایک کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ قادر مطلق رب العلمین سے بے علت نفس اپنی نسبت استوار کرنے اور خدائے عز و جل کی معیت بلا علاقہ حاصل کرنے کے لیے جہاں اپنے مریدوں اور عامۂ خلائق کو شعری پیرائے میں درس دیا ہے وہاں بارگاہِ ایزدی میں تقرب و معیت اللہ العلمین کے لیے مناجات بھی کی ہے۔[1] خوش نامہ جوان کی تصنیف ہے، اس میں "خوش" نامی لڑکی کے ذریعہ اللہ کی حمد و ثنا کے علاوہ مناجات برائے قرب و معیتِ پروردگار بھی کی گئی ہے۔
اردو ادب کی مناجاتی شاعری میں "خوش نامہ" کو ہم پہلی مستقل کوشش کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ رسالہ مکمل طور پر مناجات ہی پر مشتمل نہیں ہے پھر بھی اس کے زیادہ اشعار مناجاتی انداز کے ہیں۔ میرانجی نے نہایت رقت انگیز انداز میں "خوش" کی زبان سے مناجات کہلوائی ہے۔ یہ مناجات خالصتاً ذاتی نوعیت کی ہے، اس میں "خوش" اپنے مولائے حقیقی سے ملنے کی مشتاق ہے۔ اسی کے اضطراب میں وہ بار ہا بارگاہ ایزدی میں آہ و فغاں کرتی ہے کہ "اب تو لوگ مجھے طعنہ دے رہے ہیں، مجھے تیری آس لگی ہوئی ہے اسلیے اے بارِ الٰہ جلد سے جلد

پیغام بھجواؤ۔ دعا قبول ہوتی ہے۔ فرشتۂ اجل آکر اس کی روح قبض کرلیتا ہے اور "خوش" اپنے مولائے حقیقی سے جاملتی ہے۔ میرانجی کی نظم مناجاتی لب و لہجے میں نہایت موثر اور پُرسوز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو رحمن رحیما میرا مہر محبت بھریا　　میں تو باندی بروا تیری تیں منجہ یا توں نقریا
نا میں کیتی بندگی تیری نا دھر کیتی یاد　　دائم کیتی آگل تیرے سلگوں تجھے فریاد
تیں بھی میرا لاڑ چلایا کبھو نہ ہوا اداس　　آپ منڈلیا توڑ گسائیں تیری منجہ کو آس[1]

خوش نامہ اردو کی مناجاتی شاعری کا اولین رسالہ ہے جس میں مناجات کے تمام لوازم بحسن و خوبی برتے گئے ہیں۔
دکنی مثنویوں میں مناجات کے مضامین بھی بالعموم نفس مثنوی کے مطابق ہی لیے جاتے ہیں۔ مثلاً ملا وجہی کی "قطب مشتری" عشقیہ داستان ہے۔ اس لیے وجہی مناجات میں عشق و محبت کی باتیں کرتے ہیں۔
نصرتی (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) کی "گلشن عشق" میں بلاغت و فصاحت کے جوہر خوب دکھائے گئے ہیں۔ اسی مناسبت سے معنیٰ و بلاغت کے دھنی نصرتی نے مناجات میں سخن دانی اور معنیٰ آفرینی میں سحر حلال کی سی تاثیر عطا کیے جانے کی دعا کی ہے۔

معانی کی کھن کی مجے دے دوات　　جوہر میں کئی رتن آئیں ہات
دکھاؤں جو تج فیض تے جی خیال　　کر اس شعر کوں عین سحر حلال
ہر اک حرف تیں کر دکھا جام جم　　معانی میں تس بھر مسیحا کا دم[2]

---

[1] بحوالہ: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام: عبدالحق علی گڑھ ۱۹۶۸ء ص ۴۹ [2] ملا نصرتی (مرتبہ شیخ محمد) "گلشنِ عشق"۔ حیدرآباد ص ۱۲۔۱۳۔

اس کے علی الرغم "علی نامہ" ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ نصرتی نے اس میں دربار پادشاہی کا پرشکوہ ماحول، جنگ و جدل کے واقعات وغیرہ کی عکاسی کی ہے۔ اسی مناسبت سے مناجات میں نصرتی نے ویسا ہی طنطنہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ شجاعت و جوانمردی اور پامردی جیسی صفات اور ویسا ہی اثر اپنے اشعار کو عطا کرنے کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے۔

میرے جیب کو سیف کر آبدار — عنایت کی رک دم سوں نت تیز دھار[1]

کھرا جال ہور رن کھانپ دے مجھ قلم — مرا نام نصرت سوں کر داں علم

مرا شعر کر دے زمانے کو بہرد — یو ہر بیت اچھو شیر مرداں کو درد

معانی تے تس قرب مرداں کو دے — سکت جنگ جوئی کا گرداں کو دے[1]

دکن کے ایک غیر معروف شاعر مولانا اسحاق کی "ریاض العارفین" خالص صوفیانہ طرز کی مثنوی ہے۔ مثنوی کے موضوعات کی مناسبت سے شاعر نے مناجات میں 'عرفان' و 'حکمت' ہی کے لیے دعا کی ہے۔

سرمۂ عرفاں سوں اپنے مجہ نین — کر منور جوں چراغ انجمن

بخش مجہ کوں گنج عرفاں کی کلید — شکر دے اول بزاں نعمت مزید

مجہ درختِ علم کوں شاخِ عمل — بخش ہور تس کوں قبولیت کا پھل

دام میں حرص و ہوس کے ہوں اسیر — کر مجھے ملکِ قناعت کا امیر

دل مرا تجہ یاد سوں آباد رکھ — جز ترے سب سوں مجھے آزاد رکھ[2]

---

[1] نصرتی (مرتبہ عبدالمجید صدیقی)، "علی نامہ" حیدرآباد ۱۹۵۹ء ص ۱۰ [2] مولانا اسحٰق: ریاض العارفین (ویلور) ۱۲۷۶ھ ص ۵۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم دکنی اردو میں شعرا مثنوی کے موضوعات کی مناسبت سے مناجاتوں کے مضامین باندھا کرتے تھے۔ ان قدیم شعرا میں بعضے ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے مروجہ شعری اصناف کے علاوہ مناجاتوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاہ ابوالحسن قربی، سید جمال الدین جمالی، سید ابراہیم، سید علی زحمتی، فقیر و ناقص وغیرہم اسی قبیل کے شعرا ہیں۔

شاہ ابوالحسن قربی (م ۱۰۸۳ھ) کا مولد بیجاپور ہے۔ اردو کی نشو و نما اور ترقی و ترویج میں بیجاپور اور گولکنڈہ مرکزی حیثیت کے حامل رہے ہیں امرا و سلاطین کے علاوہ ارباب باطن بھی ان شہروں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ چنانچہ رشد و ہدایات کے سلسلوں کو بھی ان میں فروغ حاصل ہوا۔ قربی صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ تصوف و سلوک میں بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ انکے فیوض باطن سے مستفیض ہونے والوں کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ ان کے بعد ان کے اخلاف نے اس مسند سلوک کی جانشینی کی ہے۔ قربی کی مناجات میں سچے مومن کا خلوص ٹپکتا ہے اور بندے کا عجز و انکسار مناجات کے ہر لفظ سے عیاں ہوتا ہے۔ شاعر نے اس مناجات میں اللہ رب العزت سے دارین میں کامیابی چاہی ہے اور احکام الٰہی و سنن رسولؐ پر ثابت قدم رکھنے کی دعا کی ہے۔

الٰہی بھکاری ہوں تجہ دار کا — کھڑا ہوں ترے در پولے بار کا

شریعت میں دے استقامت مجے — حقیقت منے رکھ سلامت مجے

ترے ذکر و طاعت کا لذت چکا — علوم لدنی مجے سب سکا

جہاں کے تمامی یو ذرات سوں — دکھا مجہ کوں تیری حقیقت کا موں[1]

---

[1] ابوالحسن قربی "مناجات قربی" (قلمی) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد مختلف اوراق۔

سید جمال الدین جمالؔ (م ۱۱۶۲ھ) نے رشد و ہدایت کے علاوہ اپنی زندگی اللہ کی حمد و مناجات میں گزاری ہے۔ یہ دکن کے مشہور صوفی صاحبِ بصیرت شاہ کمال الدین کمال کے مرید تھے، جن کا مزار گرم کنڈہ ضلع چتور میں مرجعِ خاص و عام ہے۔ سید جمال الدین کے فیوض و برکات بھی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جمالؔ تصورِ الٰہ اور ذکرِ خدا میں رات کو صبح اور صبح کو شام کرتے رہے ہیں۔ افکار و اشغال کی لذت انھیں کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔

رات دن مجھ کوں سو تیرا دھیان یا اللہ　　کہ تجھ بن ایک تل نہ ہوئے اطمینان یا اللہ

سدا تجھ عشق کے دریا میں مجھ کوں کر شناور توں　　کہ جیوں غواص ہو لیاؤں گہرِ عرفان یا اللہ

بحق شہ کمال الدین دلی مرشد کامل　　جمالِ پاک توں اپنا مجھے دے دان یا اللہ[1]

سیدؔ تخلص کے کئی شاعر اردو میں گزرے ہیں، لیکن ایک مناجات (مترجم) میں سیدؔ تخلص کے شاعر نے اپنا پورا نام سید ابراہیم بھی لکھ دیا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود یہ مناجات "دعائے داؤد سریانی" کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں جو دعا کی تھی، اس دعا کا وہی درجہ ہے جو قرآن مجید میں سورۂ رحمٰن کا۔ اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر یہی دعا تلاوت کرتے تھے۔ اس کا عربی ترجمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ تصوف کے خانوادہ سہروردیہ میں اس دعا کے ورد کی مداومت کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ ضیاء الدین نخشبی

---

[1] جمال الدین جمالؔ: "مناجات جمال" (قلمی) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد ورق ا ب ۲ الف۔

سرہ العزیز نے اپنے مریدین کی آسانی کے لیے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ سید ابراہیم نے عربی۔ فارسی تراجم کو سامنے رکھ کر اس دعا کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

انا الموجود لا تقصد سوائی　　کثیر الخلق فاطلبنی تجد نی

تمھارا یا عبادی میں ہوں مقصود　　نہ یو جو مجھ بنا کوئی اور معبود

میں سرجن ہار ہوں یہ سب خلق کا　　جسے چاہوں کروں اک پل میں نابود[1]

سیدؔ تخلص کے کسی اور شاعر کی ایک طویل مناجات بھی ادارے میں محفوظ ہے۔ دراصل یہ مناجات بجائے خدا کے محبوب سبحانی سے کی گئی ہے، جو از روئے شریعت نہ صرف بدعت بلکہ "شرک" کے دائرے میں آجاتی ہے۔ ایسا ہی ایک اور مخطوطہ غفار نامی کسی شاعر کا ہے۔ اس میں شاعر نے حضورؐ سے التجا کی ہے۔ ان دونوں مناجاتوں کے تعارف ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دکنی کے شاعر علی زحمتیؔ کی مناجات بھی بڑی موثر اور پُر درد ہے۔ تضرع اور الحاح کی کیفیت ہر شعر سے عیاں ہے۔ شاعر گریاں کناں ہے کہ ؎

تیرا نام قاضی جو حاجات ہے　　کلیاں سبکے دل کی ترے ہات ہے

ترے فیضِ رحمت سوائے کردگار　　علی زحمتیؔ کو (ہے) تیرا ادھار[2]

زحمتیؔ کوئی کہنہ مشق شاعر دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی دکنی زبان میں مراٹھی کے اثرات بہت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاعر مراٹھی علاقے کے قریب کا رہا ہو۔

---

[1] مجموعہ وظائف کراچی بلا مورخہ ص ۵، ۱۷ [2] علی زحمتیؔ: "مثنوی مناجات" (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ ورق ۱۔ ۲۔

اب رہے فقیر و ناقص۔ تو ان کی مناجاتوں کا ایک مجموعہ ادارے میں موجود ہے۔ فقیر کی مناجاتوں میں تخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس لیے یہاں چنداں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ البتہ ناقص کی مناجاتوں میں بڑا سوز ہے۔ خواجہ محمد ناقص (م ۱۲۹۳ھ) ملکاپور (برار) کے قاضی تھے۔ محبوب الزمن کے مرتب صوفی عبدالجبار خاں مرحوم و مغفور ملکاپوری نے ناقص کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ایک مناجات میں ناقص اللہ سے ہدایت اور نیک اعمال کے لیے ملتجی ہیں۔ انداز بڑا موثر ہے اور جگہ جگہ اپنی کوتاہ دستی اور مجبوری کا اعتراف ہے۔

رضا کتب خانہ رامپور میں "وظائف فتحیہ" نام کا ایک مخطوطہ ہے، جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ نواب فتح علی خاں قزلباش لاہوری نے اسے مرتب کیا تھا۔ اس میں وہ تمام دعائیں درج کر دی گئی ہیں جو مختلف انبیاء و رسل سے منسوب ہیں۔ مثلاً دعائے آدمؑ، دعائے داؤدؑ، دعائے ابراہیمی وغیرہ۔ اس میں ایک منظوم مناجات بھی ہے جو کسی نامعلوم شاعر کی ہے۔ دعائیں بڑی رقت اور کسک ہے۔ مناجات کے ایسے ہی مجموعے "نظم الہدایت" اور "کنز المصلی" بالترتیب مولانا غلام جیلانی اور کسی نامعلوم شاعر کے نیشنل میوزیم دہلی کے مخطوطات میں ہیں۔ یہ دونوں مجموعے منظوم مناجات پر مشتمل ہیں۔ اثر آفرینی اور سوز و گداز سے پر یہ دعائیں فنی لحاظ سے نہایت کمزور ہیں۔ ان میں شعراء نے اپنی اکثر دعاؤں میں اللہ رب العزت سے دنیا میں سرفرازی اور تنگ دستی و بدحالی سے نجات چاہی ہے۔ یہ شعراء اپنی ذات کے ساتھ کائنات کی بات بھی مناجات کے ذریعہ قاضی الحاجات کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔

(باقی)

تاجکستان میں ہندشناسی

از

کمال الدین عینی☆ مترجم جناب کبیر احمد جائسی•

۱۹۱۲ء میں ایک ترک ادیب عالم جان ادریسی کا مرزا عبدالقادر بیدل پر ایک مقالہ عربی رسم الخط میں اوفا سے شایع ہونے والے ایک مجلہ "شوریٰ" کے دوسرے شمارے میں شایع ہوا تھا۔ اس مقالے میں صدرالدین عینیؒ کے اس خط کا ترجمہ شامل ہے جو انھوں نے ۱۹۱۱ء میں بخارا سے عالم جان ادریسی کو استانبول بھیجا تھا جہاں موخرالذکر مقیم تھے۔ صدرالدین عینی نے اپنے خط میں ان سوالوں کے تحقیقی جوابات لکھے تھے۔ جو ہندوستان کے اس عظیم شاعر کے سوانح اور ادبی ورثے کے سلسلے میں کیے گئے تھے۔ عینی نے اپنے جواب میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف "خزانۂ عامرہ" (سترہویں صدی) اور سراج الدین علی خاں (آرزو) کی "مجمع النفائس" میں مرقوم بیدل سے متعلق اہم اور قابل قدر معلومات فراہم کی تھیں۔ علاوہ بریں صدرالدین عینی نے بیدل کے اس کلیات سے بھی اشعار نقل کیے تھے جو ۱۹۰۳ء میں بمبئی سے لیتھو میں شایع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بیدل

☆ ممبر تاجیک اکیڈمی آف سائنسز، ۳۲ لینن اوینو دوشنبہ (تاجیکستان)

• ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

کی صحیح تاریخ پیدائش کی بھی تعیین کی تھی۔ عالم جان ادریسی اور صدرالدین عینی کی
مراسلت و مکاتبت معمولی اہمیت کی حامل نہ تھی۔ ایک طرف یہ مراسلت و مکاتبت
بیدل کی علمی میراث کی تحقیق کے اعتبار سے بخارا اور بیرون بخارا کے دانشوروں میں
عینی کی عظمت کا سکہ بٹھاتے ہیں تو دوسری طرف عالم جان ادریسی کی تحریر سے
اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ ۱۹۱۱ء ہی سے عینی ہندوستان کے عظیم شاعر
بیدل کی شاعری کے سنجیدہ مطالعے میں مصروف تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء کے بعد بھی
تن دہی سے بیدل کے بارے میں غور و فکر کرتے رہے اور ان کی زندگی کے
بعض پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی بھی کی۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے انقلاب کے
بعد عینی نے بیدلیات کا مطالعہ ایک منظم انداز سے شروع کیا جس کے نتیجے میں
۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۴ء تک ان کا ایک سلسلۂ مقالات "شرق سرخ" نامی مجلہ
میں برابر شایع ہوتا رہا جس میں بیدل کی حیات اور کلام کے مختلف پہلوؤں کو
اپنے مطالعے کا ہدف بنایا گیا تھا۔

وہ سائنسی، تہذیبی اور لسانی روایتیں جنھوں نے ہندوستان اور تاجکستان
کے عوام کو صدیوں تک ایک دوسرے سے قریب رکھا ابھی تک فراموش نہیں کی گئی
ہیں اور آج بھی یہی روایتیں سوویت یونین اور جمہوریۂ ہندوستان کی دوستی
و باہمی تعاون کو استحکام بخش رہی ہیں۔ اس امر سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا
ہے کہ تاجیکی محقق اور دانشور ہندوستان کی تاریخ و تمدن کا مطالعہ کس ذوق و شوق
سے کرتے ہیں۔ روسی اور ہندوستانی عالموں کے اس طرح کے باہمی تعاون کی ایک
قابل قدر اور دلکش مثال "وسط ایشیا کی تمدنی تاریخ" کی اشاعت کا منصوبہ ہے۔

جو چھ ضخیم جلدوں میں شایع کی جائے گی۔ اس بنیادی کام کا بیڑا بین الاقوامی
عالموں کی ایک جماعت نے اٹھایا ہے۔ ان عالموں کی تحریر کردہ جلدوں کو
انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار دی اسٹڈی آف دی کلچرس آف سنٹرل ایشیا کے
زیر اہتمام شایع کیا جائے گا۔

مذکورہ ایسوسی ایشن کے صدر، تاجیک سوویت سوشلسٹ ریپبلک
اکیڈمی آف سائنسز کے صدر اور بین الاقوامی جواہر لعل نہرو انعام یافتہ عاصموف
(محمد عاصمی) کا خیال ہے کہ اس تاریخ کو مرتب کرنا بجائے خود اس خطۂ ارضی کی
تہذیبوں کو پیشرفت کی راہوں پر گامزن کرنے ان کی مادی ترقیوں کی نشاندہی
اور اس امر کی طرف توجہ دلانے کی مترادف ہے کہ مختلف اقوام کے درمیان
دوستی و اخوت کے کتنے امکانات موجود ہیں۔

تاجکستان میں ہندشناسی کے باقاعدہ اور منظم مطالعہ کا آغاز ۱۹۵۸ء
سے ہوتا ہے جب وہاں کی اکیڈمی آف سائنسز میں "شعبۂ مطالعات شرقی
و میراث تحریری" (Department of oriental studies
and written heritage) کا قیام عمل میں آیا اس وقت سے لیکر
آج تک اس شعبہ کی پیش رفت کی سمت یہ رہی ہے کہ ہندوستان میں تحریر کیے
جانے والے ان فارسی مخطوطات کا تعارف کرایا جائے جو تاجیک اکیڈمی آف
سائنسز میں محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات پر تفصیلی مقالات لکھے جائیں اور ان کا نام
مخطوطات کی مطبوعہ فہرست میں شامل کر کے ان کے بارے میں بنیادی معلومات
فراہم کی جائیں اور گیارہویں سے بیسویں صدی تک ہندوستان میں معرض وجود میں

آنے والے فارسی کلاسیکی ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا جائے بلکہ اس کو شایع بھی کر دیا جائے اس شعبہ میں انیسویں صدی کے اردو ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو اور ہندی کا تاریخی پس منظر میں تقابلی لسانی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

اس صدی کے پانچویں دھے کے نصف آخر سے لے کر آج تک تاجیکی دانشور اور محققین ان ہندوستانی فارسی مخطوطات کو متعارف کرنے میں سرگرم عمل ہیں جو فردوسی پبلک لائبریری اور تاجیکستان کی دوسری لائبریریوں میں محفوظ ہیں ان مخطوطات میں وہ رسالے بھی شامل ہیں جن کا موضوع فلسفہ، سائنس، طب، تاریخی توقیعات، دستاویزیں اور افسانوی ادب ہے۔ تاجیک اکیڈمی آف سائنسز میں محفوظ مخطوطات کی ایک فہرست تاجیکی محققوں نے دس ضخیم جلدوں میں مرتب کی ہے ان میں سے پانچ جلدیں شایع ہو چکی ہیں اور بقیہ پانچ جلدوں کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس فہرست مخطوطات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گیارہویں صدی سے بیسویں صدی تک کے ہندوستان کے منفرد اور نایاب فارسی مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جن شاعروں اور ادیبوں کے آثار کے بارے میں اس فہرست مخطوطات میں قابل قدر مواد ملتا ہے ان میں مسعود سعد سلمان، عثمان مختاری غزنوی، ابوالفرج رونی، بدر چاچی، امیر خسرو دہلوی، حسن دہلوی اور ضیاء الدین نخشبی کے نام شامل ہیں۔ عثمان مختاری غزنوی کے منظوم "شہریار نامہ" کا ایک نادر مخطوطہ جو بارہویں صدی عیسوی کے وسط کا کتابت کردہ ہے خاص طور پر قابل ذکر ہے، شہریار نامے کے صرف دو مخطوطے پوری دنیا میں دستیاب ہیں۔

ان میں سے ایک برٹش میوزیم لندن میں ہے مگر یہ مخطوطہ ناقص[1] ہے۔ دوسرا وہی نادر مخطوطہ ہے جو تاجیک اکیڈمی آف سائنسز دوشنبہ کے ذخیرۂ عبدالغنی میرزائیف میں محفوظ ہے۔ مذکورہ ذخیرہ میں اس مخطوطے کے علاوہ اور بھی بہت سے قابل ذکر مخطوطات محفوظ ہیں مثلاً محمد قاسم فرشتہ کی 'دستور الاطباء'[2] جو قدیم ہندوستانی مخزن ادویہ (فارموکوپیا) پر مبنی ہے۔ ضیاءالدین نخشبی کی 'لذت النساء' جو سنسکرت کوک شاستر کی فارسی تشریح و توضیح ہے۔ علاوہ بریں

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی موزہ برطانیہ ج ۲ ص ۵۴۲-۵۴۳ میں مخطوطے کی فصاحت ہے، اس میں ۱۷ اوراق ہیں، اور ہر صفحہ پر ۲۹ سطریں، خط نستعلیق میں ہے اور بظاہر سترہویں صدی کی کتاب ہے' یہ مصور نسخہ ہے، اس میں ۱۲ تصویریں، آخری دو ورق میں شاہنامے کے اشعار ہیں جو داستان اسفندیار سے تعلق رکھتے ہیں، شہریار نامے کے اس نسخے کا ذکر پروفیسر صفا نے اپنی کتاب حماسہ سرائی در ایران میں ۱۹۵۵ء میں اور پھر تاریخ در ادبیات ج ۲ میں ۱۹۵۸ء میں کیا تھا، حماسہ سرائی میں ایک اور نسخے کا ذکر اس طرح ہے کہ روسی ایران شناس پروفیسر چایکین نے ایران میں شہریار نامے کا ایک نسخہ خریدا اور اسے روس منتقل کیا، اسی نسخے سے پروفیسر نفیسی کے توسط سے ڈاکٹر صفا نے ۴۹ شعر نقل کیے (حماسہ سرائی ص ۳۱۳-۳۱۵) معلوم نہیں کہ یہی نسخہ ڈاکٹر مرزائیف کے ذخیرہ میں ہے یا کوئی اور نسخہ، اگر یہ کوئی اور نسخہ ہے تو اس مثنوی کے تین نسخے مکشوف ہو گئے تھے، شہریار نامہ دیوان مختاری تصحیح جلال ہمایوں میں شامل ہے [2] طب ہندی پر ہے، اس کے نسخے عام ہیں، ہندوستان کی مختلف لائبریریوں کے علاوہ پاکستان میں اس کے ۱۴ نسخے بتائے گئے ہیں فہرست مشترک پاکستان ج ۱ ص ۵۶۲-۵۶۳- اس کو اختیارات قاسمی کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

درویش[1] محمد کی تصنیف 'طب اورنگ زیب' جس میں طبی نسخے ہندی اور فارسی میں ملتے ہیں۔

اسی ذخیرۂ عبدالغنی میرزائیف میں ہندوستان کی ایسی نایاب تاریخی دستاویزیں اور مخطوطے محفوظ ہیں جن سے سولہویں اور سترہویں صدی کے سیاسی وسماجی واقعات پر روشنی پڑتی ہے ان میں 'بدایع[2] الانشاء' بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں عبدالسلام خودنوشت 'انشائٔ' بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے اور کشمیر پر اس کے سیاسی اثرات کا مفصل ذکر ہے۔ علاوہ بریں پنڈت لچھمی[3] رام

---

[1] حکیم درویش محمد امن آبادی یا امین آبادی تھے، امن آباد یا امین آباد گجرانوالہ (پنجاب پاکستان) میں ہے، کہتے ہیں کہ حکیم درویش کو ایک گاؤں انعام میں ملا تھا، درویش نامی گاؤں ہنوز موجود ہے، ان کو شاہجہاں اور اورنگزیب دونوں کے دربار میں رسائی تھی، لیکن طبی کتاب اورنگزیب ہی کے نام پر ہے، اس کے نسخے عام ہیں، ۱۴ نسخوں کا ذکر فہرست مشترک ج ۱ ص ۶۲۲-۶۲۳ پر ہے۔

[2] بدایع الانشا نام کے کئی رسالے ہیں لیکن سب سے مشہور یوسفی ہروی کی ہے جو ہمایوں کے زمانے ۹۴۰ھ میں لکھی گئی، اسکے نسخے عام ہیں، اسکو انشای یوسفی بھی کہتے ہیں، یوسفی سکندر لودی، ابراہیم لودی بابر اور ہمایوں کے عہد کے بزرگ ہیں، ان کی تصانیف میں ریاض الادویہ کئی بار طبع ہو چکی ہے، وہ شاعر تھے، انکے دیوان کا ایک نسخہ گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس میں محفوظ ہے۔ ان کا ایک قصیدہ در لغات ہندی ہے جس میں مختلف چیزوں اور دواؤں کے نام ہندی میں درج کیے ہیں

[3] رسم الخط میں یہ لفظ واضح طور پر نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن پنڈت لچھمی رام دہلوی (وفات ۱۸۱۵ء) مفید الانشا کے مصنف ہیں، انہیں کی طرف اشارہ ہے (موزہ پاکستان، فہرست ۴۱۴)۔

کے منشآت کا ایک مجموعہ بھی جو انیسویں صدی کا ہے اس ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

مذکورہ بالا ذخیرہ میں تیس [۳۰] جلدوں سے بھی زیادہ خسرو کی تصانیف کے مخطوطے ہیں۔ خسرو کے آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ پورے سوویت یونین میں کہیں اور نہیں ہے۔ ان مخطوطوں میں غرۃ الکمال کا وہ مخطوطہ بھی شامل ہے جس کی کتابت چودہویں صدی کی ابتدا میں یعنی شاعر کے زمانۂ حیات میں ہوئی تھی۔ ہندوستان کے جن دوسرے فارسی ادیبوں اور شاعروں کے آثار اس ذخیرے میں محفوظ ہیں ان میں فیضی، ابوالفضل، طالب (آملی)، ظہوری، انیسی شاملو، غزالی، قدسی، عرفی، غنی کشمیری، منیر لاہوری، سعدالدین ہمدانی، صائب، نظیری، فانی کشمیری، ناصر علی (سرہندی)، غنیمت (کنجاہی) اور طغری کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان مخطوطوں میں کلیات عرفی کا وہ بیش قیمت مخطوطہ شامل ہے جس کی کتابت اس کے انتقال کے کچھ ہی عرصے بعد ہوئی تھی۔ غنی کشمیری کے دیوان کا وہ مخطوطہ بھی قابل ذکر ہے جس کی کتابت شاعر کے زمانۂ حیات میں ہوئی تھی۔ اس بات کا علم بہت ہی کم لوگوں کو ہے کہ اس ذخیرہ میں ابوالفضل علامی کی 'عیار دانش' کا بھی ایک مخطوطہ محفوظ ہے جس کی کتابت اس کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ ابوالفضل کے جو مخطوطات یہاں محفوظ ہیں ان میں یہ قدیم ترین مخطوطہ ہے۔

عبدالغنی میرزائیف کے ذخیرے میں انیسویں اور بیسویں صدی کی دہلی، بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ اور ہندوستان کے دوسرے اور شہروں کی لیتھو میں شایع شدہ فارسی، عربی، ہندی اور اردو کی وہ کتابیں بھی محفوظ ہیں جو ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی تالیف کردہ ہیں۔ اس ذخیرہ میں اس کی اپنی ایک کیمیکل اور فوٹو تجربہ گاہ

(لیبوریٹری) بھی ہے اور ایک جلد خانہ بھی جس میں جلد سازی کے علاوہ کتابوں کی حفاظت کے لیے 'بٹر پیپر' (Butter paper) بھی لگایا جاتا ہے، یہاں کے کارکن مختلف کیمیکل کے ذریعے مخطوطات کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ انکی مائکرو فلم بنا کر ان کو محفوظ کر لینے کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

ہندوستان کی فارسی میراث سے تاجکی محققوں اور دانشوروں کی دلچسپی تیس۳۰ برس سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ صدرالدین عینی کا مونوگراف" میرزا عبدالقادر بیدل اور ان کے آثار" ۱۹۵۴ء میں شایع ہوا تھا جس میں بیدل کے بہت سے اشعار بھی نمونے کے طور پر درج کیے گئے تھے۔ بعد ازاں اُن ہی کی صاحبزادی خالدہ عینی نے اپنا رسالہ" بیدل اور ان کی مثنوی عرفان" کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں شایع کیا۔ ۱۹۶۴ء میں صدرالدین عینی کے مجموعی آثار (colle cted workes) کی گیارہویں جلد منظر عام پر آئی (اس جلد کو خالدہ عینی نے مرتب کیا تھا اور اس پر مقدمہ بھی لکھا تھا) جس میں عینی کی وہ تمام تحریریں شامل ہیں جن کو انھوں نے بیدلیات کے موضوع پر وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں خالدہ عینی کی مرتب کردہ بیدل کی کتاب 'چہار عنصر' کا انتقادی متن منظر عام پر آیا۔ اس تنقیدی متن کی ترتیب میں خالدہ عینی کے پچیس سال صرف ہوئے تھے۔ ۱۹۸۴ء میں تاجکستان سے بیدل کے دو انتخابات کی اشاعت عمل میں آئی ایک کے مرتب آرہادی زادہ تھے اور اس کے حواشی کی تحریر میں ہادی زادہ کی شریک خالدہ عینی بھی تھیں اور دوسرا غزلیات بیدل کا انتخاب تھا جو خالدہ عینی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ تاجکستان میں آثار بیدل کی اشاعت تین زبانوں یعنی

تاجکی (روسی رسم الخط میں لکھی ہوئی فارسی) فارسی اور روسی میں ہوئی ہے۔ آثار بیدل کی اشاعت اور ان کا مطالعہ تاجکستان میں روز افزوں ہے۔

ایک تاجیک محقق اور دانشور محمد وف باقییف نے اپنی عمر کے کئی قیمتی سال امیر خسرو دہلوی کی حیات اور آثار کے مطالعے پر صرف کیے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کا مونوگراف "خسرو دہلوی اور ان کی مثنوی دول رانی و خضر خاں" شایع ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں خسرو دہلوی کا ایک انتخاب کلام شایع ہوا (اس انتخاب کے بھی مرتب باقییف تھے) بعد ازاں ۱۹۶۵ء میں حسن دہلوی کے کلام کا ایک انتخاب محمد وف باقییف اور سلامت شائی وا نے شایع کیا۔ آج کل ہندوستان کے اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ بڑی توجہ سے کیا جا رہا ہے اور اس مطالعے میں جو ادیب اور دانشور مشغول ہیں ان میں سے چند یہ ہیں، عبداللہ جان غفاروف[1]، شریف النسا پولاتووا، اے۔ علی مرزانوف، اے۔ جان فیدو۔ زیڈ۔ امرروف، ایس۔ اکراموف، ایم۔ کنا ٹوف، سلامت شائی وا، اور ایم۔ شہیدی وغیرہ۔

عبداللہ جان غفاروف کا رسالہ" مرزا غالب' حیات و آثار" ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں شریف النسا پولاتووا کا مونوگراف "غالب کے اردو خطوط" منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں ۱۹۶۷ء میں عبداللہ جان غفاروف نے غالب کے منظوم و منثور آثار کا ایک انتخاب شایع کیا، اس انتخاب میں غالب کی بہترین غزلیں، قصیدے، رباعیاں اور قطعوں کے ساتھ ساتھ 'پنج آہنگ' 'مہر نیمروز' اور 'درفش کاویانی' کے منتخب اقتباسات بھی شامل

---

[1] افسوس ہے کہ ۱۹۹۰ء کے وسط میں ان کا انتقال ہو گیا (مترجم)

کیے گئے ہیں۔ سوویت یونین میں غالب کی فارسی تصانیف سے متعلق اس مونوگراف کی پہلی اشاعت کلیات و دیوان غالب کے ان مخطوطوں پر مبنی ہے جو ہندوستان کے مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں جب سوویت یونین میں غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی اس وقت سے کانی تاجیکی ادیب اور محقق غالب کی حیات اور آثار کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ہندوستانی اور تاجیکی عوام کے ایک بہت بڑے طبقے نے امیر خسرو کی سات سو سالہ برسی منائی اس موقع پر تاجیکی ادیبوں کے جو رشحات قلم منظر عام پر آئے ان میں سے چند یہ ہیں۔ "امیر خسرو دہلوی" یہ کتاب فارسی میں شایع کی گئی ہے جو محمد عاصمی (عاصموف) اور اے۔ ایم۔ میرزائیف کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ علاوہ بریں محمد عاصمی نے امیر خسرو کے آثار کا ایک انتخاب بھی چار جلدوں میں شایع کیا۔ "امیر خسرو دہلوی۔ حیات اور آثار" کے عنوان سے ایم۔ باقییف کا مونوگراف شایع ہوا جس کے مرتب زیڈ۔ احراری تھے۔ انہی باقییف نے مثنوی "دول رانی خضر خاں" کا تنقیدی متن شایع کیا۔ مزید برآں اے۔ افصح زادہ نے "خسرو کے امثال و حکم[1]" شایع کیے۔ موخرالذکر دونوں کتابیں فارسی میں شایع ہوئی ہیں (یعنی ان کا رسم الخط بھی فارسی ہے)

ایک دوسرے ہندوستانی شاعر اور مفکر محمد اقبال کی صد سالہ برسی تاجکستان کے دانشوروں نے ۱۹۷۷ء میں منائی۔ اس برسی کے موقع پر

[1] انگریزی مقالے میں اس کا نام "Aphorsms & dicta" لکھا ہے، معلوم نہیں فارسی کا کیا عنوان ہے۔

بہت سے مونوگراف اور کتابیں شایع کی گئیں۔ مثلاً عبداللہ جان غفاروف نے "محمد اقبال" کے عنوان سے تاجیکی زبان میں ایک مونوگراف لکھا اور اس کے علاوہ انھوں نے اقبال کے منتخب کلام ایک مجموعہ بھی مرتب کیا جو مذکورہ برسی کے موقع پر شایع ہوا۔ ایک پاکستانی دانشور سید عبدالواحد کی انگریزی کتاب 'Iqbal - Activity and world out look' کا روسی زبان میں ترجمہ شایع کیا گیا۔ اس کتاب کے مترجم ایم۔ زیڈ۔ شہیدی تھے اور اس کو محمد عاصمی نے مرتب کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ شایع کیا۔

۷۷-۱۹۷۶ء میں کراچی سے عبدالغنی میرزائیف کی مرتب کردہ دو فارسی کتابیں تذکرۃ الشعرا اور خاطرات مطربی شایع ہوئیں۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اس منصوبے کی تکمیل ہوئی جو تاجکستان میں برسوں سے پندرہویں تا سترہویں صدی کے درمیان ماوراء النہر اور کشمیر میں معرض وجود میں آنے والے ادب کے مطالعے کے لیے مختص تھا۔

برسوں تک تاجیک محقق اور دانشور عہد وسطیٰ اور عصر جدید کے ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کے آثار و حیات کا مطالعہ کر کے ان پر کتابیں شایع کرتے رہے ہیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں پر خاص طور سے توجہ کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ ضیاء الدین نخشبی، غنی کشمیری، نعمت خان عالی، حسین قلی خان عظیم آبادی اور الطاف حسین حالی۔ ۱۹۷۸ء میں عبداللہ جان غفاروف کی مرتب کردہ کتاب "اشعار اخوت[1]" شایع ہو کر منظر عام پر آئی اس کتاب میں

[1] انگریزی مقالے میں اس کا نام 'Poetsy of Friendship' درج ہے، اصل نام قطعیت کے ساتھ نہیں معلوم ہے۔

انھوں نے ان تمام اشعار کو یکجا کر دیا ہے جن کے مطالعے سے ہندوستان اور
ماوراء النہر کے شاعروں کے مابین باہمی ادبی لین دین کا علم ہوتا ہے۔ اسی سال
اُمی عبداللہ جان غفاروف نے غنی کشمیری کا بھی ایک انتخاب کلام شایع کیا۔
۱۹۸۰ء میں علی مرداتوف کا مونوگراف "ضیاء الدین نخشبی اور ان کا طوطی نامہ"
منظر عام پر آیا۔ اسی سال زیڈ۔ احراروف اور ایل۔ شیر علی نے صائب کے کلام
کا ایک انتخاب شایع کیا۔ ۱۹۸۱ء میں ایس۔ اکراموف ہی نے نعمت خاں عالی
کے اشعار کا مجموعہ "چمن اندیشہ" کے نام سے مرتب کر کے شایع کیا۔

(۱۹۸۱ تا ۱۹۸۵ء) میں حسین قلی خاں عظیم آبادی کے مرتب کردہ تذکرہ
کی اشاعت تاجکی "مطالعۂ ہند شناسی" کا ایک اہم اقدام ہے۔ حسین قلی خاں
عظیم آبادی کا یہ تذکرہ جو "نشتر عشق" کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوستان میں
۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس تذکرہ میں دسویں صدی سے اٹھارہویں
صدی عیسوی تک کے ایک ہزار چار سو سے بھی زائد فارسی شعرا کے حالات
اور ان کے نمونۂ کلام درج ہیں۔ ایک تاجیک محقق اے۔ جان فیدو نے اس
تذکرہ کا متن پانچ جلدوں میں مرتب کر کے شایع کیا۔ ۱۹۸۴ء میں ایس۔ اکراموف
نے غنیمت پنجابی (کنجاہی) کی غزلیات کو مرتب کر کے شایع کیا۔ اسی سال ایچ۔ رجبوف
کا مونوگراف "موہن راکیش اور ان کے افسانے" بھی منظر عام پر آیا۔ ۱۹۸۶ء
میں ایل۔ سلامت شائی وا نے اپنا مونوگراف "حسن دہلوی کی فلسفیانہ غزلیات"
کے عنوان سے شایع کیا۔ یہ مونوگراف حسن دہلوی کی حیات اور آثار کے مطالعے
کے لیے وقف ہے وہ عہد وسطیٰ کے ایک ہندوستانی متفکر شاعر تھے جن کی ادبی

میراث دو بڑی تہذیبوں یعنی ہندی و تاجیکی (ایرانی) کو باہم دگر جذب و
پیوست کرتی ہے۔

اب بارھویں صدی عیسوی کے فارسی شاعر مختاری غزنوی کے منظوم
'شہریار نامہ' کے مخطوطہ کا عکسی اڈیشن (Facsimile) پریس جانے
کے لیے تیار ہے جس کو کمال الدین عینی نے مرتب کیا ہے۔

ہند شناسی کے تاجیک ماہرین صرف سائنسی تحقیقات ہی میں سرگرم عمل
نہیں رہے بلکہ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں
پر عام سائنسی کتابیں اور مقالے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان ماہر ہند شناس ادیبوں
اور عالموں کی حیات اور آثار پر محققانہ کتابیں لکھنے کے علاوہ ہندوستان کے
اصلی و حقیقی مسائل پر کتابیں لکھی ہیں؛ علاوہ بریں ان افراد نے ہندوستان کے
فارسی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی ادبی کاوشوں کو بھی روسی اور تاجکی
زبانوں میں ترجمہ کر کے شایع کیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر
بھی اس طرح کے موضوعات پر تقریریں نشر ہوتی ہیں اور اخبارات و رسائل میں
بھی ایسے مضامین شایع ہوتے ہیں جن سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں
نے سائنس اور تہذیب و تمدن میں کیا پیشرفت کی ہے۔

ہندوستانی فارسی شاعروں کے جیبی سائز کے جو مجموعۂ کلام فارسی اور تاجکی
(روسی) رسم الخط میں برابر شایع کیے جاتے ہیں وہ تاجیکوں میں بہت مقبول ہیں
اس طرح کی کتابوں کی اشاعت سے تاجیکستان کے عوام قدیم ہندوستانی
شاعروں کے نام اور کلام سے آشنا ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ش۔ پولاتووا نے

غالب کی فارسی رباعیوں کو فارسی اور تاجیکی دونوں رسم الخطوں میں شایع کیا۔ ۱۹۸۳ء میں سروجنی نائیڈو پیر ایم۔ شہابوا کی تحریر کردہ کتاب منظر عام پر آئی۔ ۱۹۸۴ء میں اے۔ مختاروف کی کتاب "ہندوستانی میوزیموں میں محفوظ تاجیکی خزائن" شایع ہوئے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے اس سہ ماہی سفر کا حال بیان کیا ہے جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں کیا تھا۔ اسکے علاوہ انہی اے۔ مختاروف نے دہلی، علی گڑھ، پٹنہ، حیدرآباد اور رامپور کے کتابخانوں میں محفوظ اس تمام مواد کو بھی دیکھا جس سے ہندوستان اور تاجکستان کے قدیم ادیبوں اور شاعروں کے باہمی ادبی روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

گذشتہ تیس (۳۰) برسوں میں تاجکستان کے دانشوروں اور محققوں نے سو سے زیادہ مونوگراف اور تنقیدی متون شایع کیے اور سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مقالات لکھے اور شایع کیے گئے ہیں جن سے ہندوستان کی سائنسی، تہذیبی اور لسانی میراث پر روشنی پڑتی ہے۔

ہندوستانی اور تاجیکی عالموں اور دانشوروں کا علمی اشتراک بھی روزافزوں ہے۔ ۱۹۸۵ء میں جبکہ مشرق کے عظیم دانشور اور سائنس داں الخوارزمی کی ایک ہزار دوسوویں برسی منائی گئی، اس زمانے میں ڈاکٹر رضیہ جعفری اور وائی۔ ایس مالٹ سیف کے اشتراک سے ایک "البم مونوگراف" شایع کیا گیا جو "صورۃ الارض" پر مبنی ہے اور اس کا مقدمہ کمال الدین عینی کا تحریر کردہ ہے۔ یہ کتاب کشمیر یونیورسٹی کے سنٹر فار دی اسٹڈی آف سنٹرل ایشیا اور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز آف دی اکیڈمی آف سائنسز آف تاجیک سوویت سوشلسٹ ریپبلک دوشنبہ

کے اشتراک سے شایع ہوئی تھی۔

تاجیکی ہندشناسوں نے مستقبل کے لیے بھی کچھ علمی منصوبے تیار کیے ہیں۔ ۱۹۸۵ء سے شروع ہوکر ۱۹۹۰ء میں ختم ہونے والے زمانے میں تاجیکی محققین اور دانشور ہندوستان کے فارسی ادب کی ایک تاریخ مرتب کریں گے۔ یہ تاریخ ادب متعدد جلدوں میں ہوگی اور اور اس میں گیارہویں صدی سے لیکر بیسویں صدی تک کے ہندوستانی فارسی ادب کا مطالعہ اس طرح کیا جائیگا کہ اسکی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقی کے سارے نکات واضح و روشن ہو سکیں گے۔ یہ تاریخ ادبیات اس سعی و کاوش کا ایک زندہ ثبوت ہوگی جو تاجیکی دانشور اور محققین گذشتہ تیس (۳۰) برسوں سے زیادہ عرصے سے ہندشناسی کی نسبت سے انجام دے رہے ہیں۔ اس قابل قدر تاریخ ادبیات کی تکمیل کے لیے تاجیکی محققین ہندوستانی محققین کی قابل قدر خدمات حاصل کریں گے۔ ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ تاجکستان کے عوام کے ایک بڑے طبقے کے لیے ہندوستان کے عظیم 'رزمیہ مہابھارت' کا فارسی ایڈیشن شایع کیا جائے۔ نیز رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، کرشن چند، عصمت چغتائی، امرتا پریتم اور دوسرے ہندوستانی ادیبوں کے منتخب آثار کے تاجیکی زبان میں ترجمے شایع کیے جائیں گے۔

عصر حاضر میں تاجکستانی ریپبلک میں ہندشناس سائنسی ماہرین اور استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول رکھی گئی ہے اور اس سلسلے میں تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے اورینٹل اور نیشنل ایجوکیشن منسٹری ہر ممکن اعانت کرتی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں ہندشناسی کے لیے لینن یونیورسٹی کے اورینٹل اسٹڈیز کے شعبے میں ایک نئی کرسی (Chair) قائم کی گئی۔ اس کے تحت ماہرین ہندشناس مثلاً ش۔ پولاتووا، ایچ۔ رجبوف، ایم۔ عثمانوف، آئی۔ نوروف اور دوسرے حضرات ہندوستان کی تاریخ، تاریخ تمدن، ادب لسانیات اور عصر حاضر کے سماجی و سیاسی طریق پر لیکچر دیتے ہیں۔ انڈین اسٹڈیز کے شعبہ سے منسلک حضرات طلبہ کی رہنمائی

کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس شعبہ کے اساتذہ جدید ہندوستان کے بارے میں اپنا حاصل مطالعہ پیش کرتے رہتے ہیں مثلاً "جنگ عظیم دوم کے بعد کا ہندوستان کا ہندی ادب" "عصر حاضر میں تاجیکستان اور ہندوستان کے سائنسی اور تہذیبی روابط، اردو زبان کے افعال وغیرہ اس سلسلے میں شایع ہوئے ہیں۔

تاجیکی علما اور دانشور "آل یونین" اور "انٹرنیشنل سائنٹفک" جلسوں میں برابر شرکت کرتے رہتے ہیں اور ہند شناسی کے موضوع و مسائل پر تحریراً اور تقریراً اظہار خیال کرتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں دہلی میں جو چھبیسویں (۲۶) اورینٹلسٹس کی بین الاقوامی کانگریس ہوئی تھی اس میں بابا خان غفوروف، اے۔ ایم میرزائیف، کمال الدین عینی اور اے۔ مختاروف اور پروفیسر عثمانوف نے شرکت کی تھی اور اپنے مقالات اس کانگریس میں پیش کیے۔

اکثر ہندوستانی ادیب بھی تاجیکستان آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، جنھوں نے عبدالغنی میرزائیف کے ذخیرۂ مخطوطات میں ۱۹۸۳ء میں کچھ کام کیا تھا۔ انھوں نے " my Tajik Friends " کے نام سے ایک رسالہ انگریزی میں شایع کیا۔

مشہور تاجیکی ماہر شرقیات باباجان غفوروف (۱۹۰۹-۱۹۷۷ء) کے الفاظ میں "تمام وسط ایشیائی قوموں کی طرح تاجیکی قوم کی تاریخ بھی ہندوستان، افغانستان، ایران اور عرب کے عوام کی تاریخ سے مربوط ہے" تاجیکی علما اور محققین اس تاریخی رابطے کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں جو ہندوستان اور وسط ایشیا کے عوام کے درمیان رہا ہے اور یہی رابطہ آج ان کو امن اور سماجی پیش رفت کے حصول میں مربوط کیے ہوئے ہے۔

معارف کی ڈاک

باسمہٖ عز و جل

علی گڑھ ۲۴ر جولائی ۱۹۹۱ء

مکرم و محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

خدا کرے آپ بخیر ہوں، معارف مئی ۹۱ء کے شمارے میں "برصغیر میں قرآن حکیم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ" کے عنوان سے ڈاکٹر دفا راشدی صاحب کا مضمون نظر سے گذرا۔ اس میں بعض باتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں مثلاً مضمون نگار لکھتے ہیں۔

"حضرت مخدوم نوح سرور ہالائی سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے دسویں صدی ہجری میں القرآن الحکیم کا مکمل ترجمہ مع تفسیر فارسی زبان میں کیا یہ نہ صرف سندھ بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ ہے"۔

پھر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"ساتویں صدی ہجری یعنی حضرت مخدوم نوح کے ترجمہ سے پہلے کی صدیوں میں علماء، فقہائے ہند نے اپنے اپنے عہد میں قرآن شریف کے فارسی ترجمے کیے لیکن یہ تمام کے تمام ترجمے چند سورتوں اور آیتوں تک محدود تھے مثلاً علامہ شمس الدین دولت آبادی ثم الدہلوی کی تفسیر بحر الامواج نویں صدی ہجری کی تالیف ہے یہ سورۂ فاتحہ سے سورۂ انعام تک ہے"۔ الخ۔

یہ دونوں باتیں تاریخی طور پر غلط ہیں اس حیثیت سے مضمون نظر ثانی کا محتاج ہے مخدوم نوحؒ دسویں صدی ہجری کے عالم ہیں جبکہ آٹھویں صدی ہجری میں حسن بن محمد معروف بہ نظام نیشاپوری کی تفسیر "غرائب القرآن و رغائب الفرقان" وجود میں آچکی تھی۔ یہ تفسیر اگرچہ

عربی میں ہے مگر ترجمہ فارسی زبان میں ہے (ملاحظہ ہو کشف الظنون ۱۹۵/۲ دائرہ معارف اسلامیہ ۵۳۱/۴، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت حاشیہ ۱۴۲/۱ وغیرہ)[1] نیز آٹھویں صدی ہجری میں ہی تفسیر تاتار خانی وجود میں آئی جو بادشاہ فیروز شاہ تعلق کے وزیر امیر تاتار خاں کے ایما پر علما نے مرتب کی اور اس کے اصل مرتب مولانا عالم دہلوی تھے (ملاحظہ ہو گلزار ابرار اردو ترجمہ ص ۴۹۳ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۳۹۲، نزہتہ الخواطر ۱۸/۲) اسی طرح تفسیر نور بخشا مولفہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی اور بحر المعانی مولفہ محمد بن احمد خواجگی مکمل تفسیریں ہیں[2] دولت آبادی کی تفسیر کا نام بحر الامواج کے بجائے بحر مواج ہے جس کے مولف ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی ہیں نہ کہ شمس الدین دولت آبادی نیز یہ تفسیر صرف سورۃ الانعام تک نہیں ہے بلکہ مکمل ہے[3]۔ اور اس کا ایک کامل نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہے، واضح رہے کہ یہ تفسیر مطبع نولکشور سے شایع بھی ہو چکی ہے اور اب نایاب ہے، یہ فارسی تفسیر متعدد خوبیوں کی حامل اور الکشاف کے ہم پلہ سمجھی گئی ہے، اس کا عربی ترجمہ شیخ منور بن عبد المجید نے قلعہ گوالیار میں اسیری کے زمانہ میں کیا تھا جو ضبط کر لیا گیا[4]۔ بہر صورت فاضل مقالہ نگار کے مذکورہ دونوں بیانات تاریخی ثبوت سے محروم ہیں اور ان کو چاہیے کہ ان حقایق کی روشنی میں از سر نو غور کریں۔ والسلام

---

[1] تفسیر اور مفسر کے بارے میں ہمارے رفیق مولوی محمد عارف عمری کا ایک تحقیقی مضمون اگست سنہ ۸۹ء کے معارف میں چھپا ہے جس سے مکتوب نگار کی تائید ہوتی ہے، لیکن واضح رہے کہ نیشاپوری کا ہندی الاصل ہونا محقق نہیں ہے۔ (معارف) [2] مگر یہ سب تفسیریں ہیں ترجمے نہیں، [3] یہ سب باتیں بجا ہیں۔ [4] یہ ساری باتیں بلا حوالہ ہونے کی وجہ سے تاریخی صداقت سے محروم ہیں (معارف)

اخبار علمیہ

برطانیہ کے موقر سہ ماہی مجلہ مسلم ورلڈ بک ریویو کے بعض مشمولات کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، اب اس کے سنہ ۱۹۹۰ء کے تین شماروں میں انگریزی زبان میں قانون اسلامی پر شایع شدہ کتابوں، مقالات اور مضامین کی کتابیاتی فہرست، ڈاکٹر ظفر الاسلام لکچرر ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بڑے سلیقہ اور حتی الامکان استیعاب کے ساتھ دو حصوں میں مدون کی ہے، پہلے حصہ میں تعزیری، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی کی عام ذیلی سرخیوں کے تحت کتابوں اور تحقیقی مقالوں کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں اسی ترتیب کے ساتھ عام مضامین کا احاطہ و استقصا کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں اسلامی قانون سے کس درجہ اعتنا کیا گیا ہے۔ اور اس میں خود مسلمان اہل قلم کا کتنا حصہ ہے، لائق مرتب کی یہ سعی قابل قدر ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ اب یہ کتابی صورت میں بھی شایع ہو رہی ہے۔

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ پر گذشتہ سال مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ایک اعلیٰ درجہ کا سمینار ہونے والا تھا مگر نامناسب حالات

کی وجہ سے اسے موخر کر دیا گیا، اب امید ہے کہ انشاء اللہ اس سال کے اواخر تک اس کا انعقاد عمل میں آئے گا، مولانا فراہیؒ پر اب تک متعدد کتابیں اور خاصے مضامین شایع ہوچکے ہیں، ڈاکٹر ظفر الاسلام ان کی بھی ایک ببلوگرافی کی تیاری میں مصروف ہیں، اس میں مولانا فراہیؒ کے سوانح، تصنیفات، ان کے تراجم، مضامین، اشعار و مکتوبات غرض ان کے متعلق تمام تحریروں اور تبصروں وغیرہ کی نشاندہی کی جائے گی، یہ کتابیاتی فہرست، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کے ششماہی مجلہ علوم القرآن میں شایع ہورہی ہے، کتابی صورت میں بھی یہ اسی ادارہ کیجانب سے طبع ہوگی، "کتابیات فراہیؒ" سے متعلق قارئین معارف کے پاس اگر معلومات ہوں تو وہ ڈاکٹر ظفر الاسلام، ادارہ علوم القرآن سر سید علی گڑھ سے مراسلت کرسکتے ہیں۔

حقائق کی وضاحت وادراک میں اعداد و شمار کی خاص اہمیت ہے، ماہ جون کے انگریزی رسالہ مسلم انڈیا میں ہندوستان میں سائنس، ٹکنولوجی اور فوجی و نیم فوجی اور دوسرے کئی قومی اعزازات مثلاً ادم پرکاش بھیسن فاونڈیشن اوارڈ، یو جی سی اوارڈ برائے ریسرچ سائنٹسٹ، بی ایم برلا اوارڈ، سی وی رمن میڈل، شانتی سروپ بھٹناگر میڈل، ہومی جے بھابھا اوارڈ، کے آر راما ناتھن میڈل، پرم وششٹ سیوا میڈل، کیرتی چکر، اتم یدھ سیوا میڈل، اتی وششٹ سیوا میڈل، ویر چکر شوریہ چکر، بھارت رتن، پدم بھوشن، پدم شری وغیرہ میں مسلمانوں کی شرکت اور ان کے تناسب کو پیش کیا گیا ہے، سائنس اور ٹکنولوجی کے ۱۶۴ اعزازات میں ان کا حصہ صفر ہے،

پولیس میڈل کے ۵۰ اعزاز یافتگان میں بھی وہ صفر کے برابر ہیں انکے علاوہ دوسرے تمام شعبوں میں بھی وہ بمشکل ایک یا دو فیصد ہیں، ہمارے معاصر رسالہ نے (ROLL OF BACKWARDNESS) کی سرخی قائم کرکے اس پسماندگی اور محرومی کا شکوہ کیا ہے، پسماندگی اور تنزلی کا یہ آئینہ حیرت وعبرت کے لیے ہے۔

اسلام آباد پاکستان کی بین الاقوامی اسلامی جامعہ کے ایک شعبہ دعوہ اکیڈمی کی جانب سے اس کا انگریزی ترجمان دعوہ کے نام سے شایع ہوتا ہے اس کے مارچ کے شمارہ میں تھائی لینڈ کے جنوبی خطہ پٹانی PATTANI کا تعارف بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہے، پٹانی کی آبادی تقریباً ۳ ملین ہے اور اس میں نوے ۹۰ فیصد مسلمان ہیں، ان مسلمانوں کی اکثریت صوبہ سرحد کے پٹھانوں کی نسل ہے اور ان کی نسبت سے اس علاقہ کا نام پٹانی پڑا، یہ مسلمان سولھویں صدی میں ہجرت کرکے وہاں آباد ہوئے اور وہ مقامی چینی نژاد بدھوں کے علاوہ یورپ کی استعماری طاقتوں سے مسلسل نبرد آزما ہوتے رہے، ان کے چند اہم مسائل میں سترہویں صدی کی ایک مسجد کا قضیہ ہے جو اپنی صورتحال کے سبب بابری مسجد کے قضیہ سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے، چینیوں نے اس مسجد سے متصل اپنی ایک عبادت گاہ کسی قدیم افسانوی روایت کی بنیاد پر تعمیر کی، مسلمانوں نے احتجاج کیا اور بجز نماز جمعہ کے اور نمازیں کسی طرح ادا کرتے رہے، نزاع میں شدت

آئی تو حکومت نے اسے تاریخی یادگار قرار دینے کی کوشش کی، اب معاملہ یہ ہے کہ مسلمان اس کی بحالی کے طالب ہیں، چینی بدھسٹ اپنی عبادت گاہ میں مزید توسیع چاہتے ہیں، بدھ زائرین کی صورت میں ان کے لیے یہ آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گئی ہے اور حکومت اسے تاریخی یادگار بنانے پر مصر ہے نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ سال نومبر میں وہاں تشدد آمیز نزاع ہوا اور مستقبل میں اور زیادہ خونریزی کا اندیشہ ہے۔

بابری مسجد کے متعلق دارالمصنفین کی کتاب "**بابری مسجد**" تاریخ کے پس منظر و پیش منظر میں" کے مراٹھی زبان میں ترجمہ کی خبر کئی مہینہ قبل روزنامہ سالار بنگلور میں نظر سے گذری، اسے پونہ سے اردو مراٹھی پرکاشن نے "بابری مشید کی رام جنم بھومی" کے نام سے عمدہ طباعت کے ساتھ شایع کیا ہے، غیر مسلم مراٹھی داں حضرات تک جو حضرات اسے پہنچانا چاہیں ان کے لیے یہ کتاب ۵۰ فیصد رعایت کے ساتھ یعنی ۳۰ روپیے میں مل جائے گی، پبلشر کا پتہ ہے، اردو مراٹھی پرکاشن، ۴۲۵، کیداری روڈ، پونہ ۴۱۱۰۰۱۔

انسان نے ظلم وطغیان کا جو طوفان اٹھا رکھا ہے اس کا عملی مشاہدہ امریکی خلانوردوں نے امریکی خلائی جہاز اٹلانٹس میں بیٹھ کر کیا، انھوں نے کرۂ ارض کو غبار اور کہرے کے دبیز پردوں میں لپٹا ہوا دیکھا، ان کا خیال ہے کہ یہ کثیف دھند جاپان اور فلپائن کے آتش فشاں اور کویت کے تیل کے جلتے ہوئے کنوؤں کی وجہ سے ہے لیکن کہیں یہ مظلوموں کی آہوں کا دھواں تو نہیں؟

(ع۔ص)

وفیات

مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم

عمیر الصدیق دریابادی ندوی

افسوس کہ مولانا محمد یوسف صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند کا ۴؍جولائی کو دن میں ڈیڑھ بجے رامپور میں انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

ان کی وفات سے ملک وقوم کے دردمند وہوشمند اور مخلص و فعال رہنماؤں کی صف اور سونی ہوگئی۔

جماعت اسلامی سے ان کا تعلق بڑا دیرینہ تھا ۴۸ء میں منقسم ہندوستان میں جماعت کی تشکیل نو کے وقت وہ جماعت کے قیم مقرر کیے گئے، ۷۲ء تک وہ اس منصب پر فائز رہنے کے بعد امیر جماعت منتخب کیے گئے ۸۰ء تک اس پر فائز رہے۔ جماعت کے کئی اور اداروں جیسے بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز، دعوت ٹرسٹ اور اشاعت اسلام ٹرسٹ وغیرہ کے بھی وہ چیرمین تھے پیرانہ سالی اور عوارض واعذار کی وجہ سے ادھر کئی برسوں سے وہ گوشہ گیر ہوگئے تھے مگر ملی وقومی مسائل سے باخبر اور ان کے متعلق فکرمند رہا کرتے تھے، گو انکے دور امارت میں

جماعت کو ابتلا و آزمایش کا سامنا کرنا پڑا تاہم انھوں نے اس کو ترقی و استحکام کی راہ پر گامزن رکھا، ملک کے دوسرے اسلامی اداروں اور اشخاص سے بھی ان کا تعاون و اخلاص کا معاملہ رہا، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے وہ رکن رکین تھے، قومی و ملکی مسائل پر ان کی وسعت نظر، فراخدلی اور اشتراک عمل کے جذبہ کی قدر کی جاتی تھی، وہ جماعت کے اہم اجتماعات میں دوسرے مکاتب فکر کے افراد کو بھی اظہار رائے کے لیے مدعو کرتے، ان کی تقریریں اور خطبات عام طور سے نہایت متوازن، جامع اور با مقصد ہوتے، گفتار کے علاوہ کردار کے میزان میں بھی وہ پورے اترے، ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے دور ابتلا میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرکے اور پس دیوار زنداں اسلام کے پیام کو اپنے قول و عمل سے پیش کرکے اسوۂ یوسفی کو تازہ کردیا، جب ۱۹۷۹ء میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کے نتیجہ میں جماعت اسلامی کے خلاف ہندوستان کے بعض حلقوں میں بڑی برہمی ہوگئی تھی تو انھوں نے نہایت دردمندانہ انداز میں ایک سالہ "دیالیت قومی یعلمون" کے بلیغ و برمحل عنوان سے شایع کیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا، عالمی مساجد کونسل اور موتمر عالم اسلامی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے بیرون ملک جماعت اسلامی کے وقار میں اضافہ کیا، ان کے دور امارت کی ایک یادگار ۱۹۸۱ء کا اجتماع حیدرآباد بھی ہے، اس میں عالم اسلام کی بعض نمایاں و مقتدر ہستیوں کی شرکت سے اس کی حیثیت ایک عالمی اجتماع کی سی ہوگئی، شکل و صورت اور وضع قطع کی مانند اپنے گفتار و کردار میں بھی پاکیزہ اور خوش اطوار تھے، جو لوگ ان کے قریب رہے وہ ان کی دینداری، سادگی، فروتنی، اخلاص، ایثار اور شیریں کلامی کے مداح و معترف رہے ہیں۔

دارالمصنفین کے سابق شریک ناظم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے حادثۂ وفات پر انھوں نے جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے نام تعزیتی خط میں لکھا تھا کہ "ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے، آج وہ تو کل ہماری باری ہے، وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو کامیابی کے ساتھ مراحل حیات طے کرکے اپنی ابدی جائے قرار کے لیے روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم سے حوض کوثر پر اس دن ملائے جس دن ہر مومن بندہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو پالے گا اور پھر جدائی کا کوئی سوال نہ ہوگا"۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کو جام کوثر و تسنیم سے سیراب کرے اور انکے پسماندگان ظاہری و معنوی کو صبر و رضا کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی مرحومؒ

ماہ جون میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ عربی کے صدر اور ندوۃ العلماء کے ایک لائق فرزند ڈاکٹر سید محمد ابراہیم ندوی کے انتقال کی خبر بھی علمی و دینی حلقوں میں بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی، ابھی ان کی عمر تقریباً پچاس برس تھی،

ان کا اصل وطن استھانواں ضلع پٹنہ ہے یہاں انکا خاندان اپنے علم و فضل کی وجہ سے نمایاں تھا، انکے دادا مولانا محمد احسن استھانوی اپنے وقت کے اچھے اہل علم و قلم تھے اور انکے والد مولانا سید ہاشم ندوی بھی ذی علم بزرگ تھے جو تلاش معاش کے لیے حیدرآباد گئے اور وہیں دائرۃ المعارف سے وابستہ ہوئے، تاریخ کامل ابن اثیر حصہ دوم کا ترجمہ انکی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے جس کو دارالترجمہ نے ۱۹۲۶ء میں شایع کیا، عرصہ تک دائرۃ المعارف کی عربی کتابیں انکی تصحیح و حواشی کے ساتھ چھپتی رہیں جس کے آخر میں وہ ناظم بھی ہوگئے تھے، ابن درید کی المجتنیٰ شایع ہوئی تو اس میں صاحب کتاب کے سوانح انھوں نے دیدہ ریزی سے لکھے جس کی تحسین مولانا سید سلیمان ندوی نے کی، انھوں نے اپنے فرزند سید ابراہیم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے لیے بھیجا جنھوں نے بعد میں ایم، اے، پی ایچ، ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی کے عہدہ تک

مرتی کی مگر انکی عالمانہ وضع قطع میں فرق نہیں آیا، اپنی پاک وصاف زندگی کیوجہ سے انھوں نے اپنے خاندان اور ادارہ کے نام نیک میں اضافہ ہی کیا، رابطہ ادب اسلامی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے استنبول ترکی کے ایک اہم اجتماع میں شرکت کی، یونیورسٹی کی جانب سے بھی وہ مذاکروں اور مباحثوں میں شریک ہوتے رہے، صدر جمہوریہ ہند نے انکی عربی قابلیت کے اعتراف میں سند اعزاز بھی عطا کیا۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی وہ مقبول رہے، وہاں کے مشہور روزنامہ سیاست کے ادبی کالموں میں انکے مراسلات بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے، اللہ تعالیٰ انکے مراتب و درجات بلند کرے اور انکے متعلقین و پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا محمد سلمان خاں بھوپالی ندوی مرحوم

ندوۃ العلماء کے ایک ورلایق فرزند اور مولانا محمد عمران خاں بھوپالی ندوی مرحوم کے برادر خورد جناب مولانا محمد سلمان خاں ندوی مرحوم کی وفات حسرت آیات کی خبر بہت تاخیر سے انکے صاحبزادے مولوی حافظ کلیم الرحمن خاں ندوی کے ایک خط سے ملی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ وہ دار العلوم تاج المساجد کے سابق مہتمم تھے لیکن ان کا سب سے روشن کارنامہ تاج المساجد کی تعمیر ہے، مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم نے جس شاہانہ اولوالعزمی سے اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر و تکمیل کا خاکہ بنایا تھا اسکو مولانا سلمان خاں صاحب نے حقیقتاً رنگ و روغن عطا کیا، جن لوگوں نے مسجد کی تعمیر و تکمیل میں انکی شبانہ روز کی محنت، جانفشانی اور لگن دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس تعمیر میں ان کا لہو تک شامل ہو گیا، ایک عالم کی اس معمارانہ اور مہندسانہ مہارت پر بڑے بڑے انجینیر اور آرکیٹکٹ بھی حیران رہ گئے، طبعاً وہ نہایت شریف، متین، کم سخن اور مہمان نواز انسان تھے، اپنے تمام بیٹوں کو انھوں نے حفظ قرآن مجید کی دولت سے بہرہ یاب کیا اور سب کو ندوہ میں تعلیم دلائی، وہ خود بڑے دیندار تھے متعدد بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ انکی نیکیوں اور دینی خدمات کو قبول کرے اور جنت نعیم میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

باب التقریظ والانتقاد

المعرّب من الکلام الاعجمی علیٰ حروف المعجم

تصنیف: ابومنصور الجوالیقی موہوب بن احمد بن محمد بن الخضر تحقیق: ڈاکٹر ف عبدالرحیم

صفحات ۷۰۸ مجلد، قیمت درج نہیں۔ دار القلم دمشق۔

لسانیات (فیلالوجی) میں علم الاشتقاق کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس میں الفاظ ولغات کی وسعت اور شاخ درشاخ صورتوں اور انکے اصل ماخذ پر بحث وتحقیق کی جاتی ہے اس زمانہ میں یہ اہل تحقیق کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔

عربی دنیا کی بڑی اور اہم زبانوں میں ہے جو ایکطرف متعدد زبانوں پر اثر انداز ہوئی اور دوسری طرف اس نے خود بھی ان زبانوں کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات کو اپنے اندر جذب کر لیا جو بعد میں صوتی تغیرات کے ساتھ اس کا ایک حصہ بن گئے، ان دخیل اور نو وارد الفاظ کے اشتقاق اور انکے ماخذ کی تحقیق وجستجو کا کام عہد اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں شروع ہو گیا تھا اور اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے مستند اور جامع کتاب جوالیقی کی المعرب ہے اس میں سات سو تیس ۷۳۰ ایسے الفاظ یکجا کیے گئے ہیں جو غیر زبانوں سے عربی میں داخل ہوئے ان میں ایک سو تیس ۱۳۰ اشخاص اور اشیا کے نام بھی درج ہیں، یہ مجموعہ اصلاً تو ابن درید کی جمہرۃ اللغۃ سے ماخوذ ہے اور کسی قدر الفاظ ازہری کی تہذیب اللغۃ اور

ابن قتیبہ کی ادب الکاتب سے ماخوذ ہیں، ان کے علاوہ کچھ الفاظ ایسے بھی جمع کیے گئے ہیں جن کے مآخذ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۶۷ء میں ایڈورڈ زخاؤ کی تحقیق کے ساتھ لیپزک سے شایع ہوئی تھی، پروفیسر زخاؤ کے حواشی جرمن زبان میں تھے جن میں بعض الفاظ کے اصل مآخذ کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے۔

دوبارہ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں شیخ احمد محمد شاکر کی تحقیق کے ساتھ طبع ہوئی جس میں متن کی تصحیح پر زیادہ توجہ دی گئی لیکن الفاظ کے اصل مآخذ پر خاطر خواہ بحث نہیں کی گئی تھی،

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کا خیال عہد حاضر کے ماہر لسانیات ڈاکٹر ف۔ عبدالرحیم صاحب استاد مدینہ یونیورسٹی کو ہوا چنانچہ ان کی تحقیق و محنت سے اب کتاب کا تیسرا ایڈیشن شایع ہوا ہے۔ یقیناً اس سے جوالیقی کی کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے اس بنا پر اس کو تحقیق کے بجائے المعرب کا تکملہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، دراصل فاضل محقق نہ صرف عربی زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں بلکہ وہ مختلف عالمی زبانوں کے بھی ماہر ہیں ان کے قلم سے کتاب کے آغاز میں اٹھاسی صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں دخیل اور نووارد الفاظ کے اقسام، ان کے مآخذ اور ان کے صوتی تغیرات وغیرہ پر مفید بحث کی گئی ہے، فاضل محقق نے اس امر کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ دو زبانوں کے دو لفظوں کو محض صوتی ہم آہنگی کی بنا پر ایک دوسرے سے ماخوذ بتانا درست نہیں ہے، یہ فیصلہ تو دونوں زبانوں کے الفاظ کے اشتقاق پر گہری نظر ڈالنے نیز ان کے تاریخی تعلق کا ثبوت فراہم ہونے کے بعد ہی

کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عربی کے متداول قیاسی اوزان سے ہٹ کر جو الفاظ مستعمل ہوئے ہیں ان کو بھی قدیم علمائے لغت نے معرّب قرار دیا ہے، فاضل محقق نے اس طرح کے لفظوں کی بعض مثالیں اپنی جانب سے دی ہیں اور بتایا ہے کہ عربی میں یہ الفاظ مندرجہ ذیل زبانوں سے منتقل ہوئے ہیں۔ پہلوی فارسی، یونانی، لاطینی، سریانی، عبرانی، حبشی اور ہندوستانی انھوں نے ان زبانوں سے منتقل ہونے والے الفاظ کی علٰحدہ علٰحدہ فہرست بھی دی ہے۔

فاضل محقق نے مصنف کی تحقیق کو مدلل طور پر پیش کرنے کے علاوہ جابجا اس کی تصحیح کا بھی کارنامہ انجام دیا ہے، یہ اختلاف بھی مدلل ہے، البتہ اہلیلج کے متعلق مصنف کا صرف یہ کہہ دینا کہ اصلہ من الھند (ص ۱۲۹) کہ یہ ہندی الاصل ہے۔ تشفی بخش نہیں ہے۔

کتاب کی طباعت بہت عمدہ اور خوشنما ہے مراجع کی فہرست اور حروف تہجی کے اعتبار سے دخیل الفاظ کے انڈکس نے اس کی قدر و قیمت دو چند کر دی ہے۔

ناظرین کو تعجب ہوگا کہ فاضل محقق ہندی نژاد ہیں، انھوں نے عربی زبان و ادب کی یہ مفید علمی و تحقیقی خدمت انجام دے کر اہل ہند کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔

ع۔ ص۔

....

ادبیات

علامہ اقبال سہیل

جناب اختر انصاری

خاکِ اعظم گڈھ سے اک ذرہ چمک کر جو اٹھا — آسمان ہند کا وہ نیر اعظم ہوا
کر دیا جس کی شعاع فکر نے روشن فضا — جوہر قابل وہ علامہ سہیل اقبال تھا

ہم نشین شبلی و سید تھا وہ دانائے راز
تھا جسے حاصل فن شعر و ادب میں امتیاز

وہ کہ اپنی ذات سے تنہا تھا رشک انجمن — جس کے انداز تبسم سے کھل اٹھتا تھا چمن
جس کو قدرت نے دیا تھا علم و فن کا بانکپن — یعنی سب سے منفرد تھا جس کا اسلوب سخن

کر دیا جس کی نظر نے پردۂ اسرار چاک
ہو گئی ہے زندۂ جاوید جس کی نعت پاک

وہ بیاں کرتا رہا عہد سلف کی داستاں — وقف تھی مدح صحابہ کے لیے جس کی زباں
آج بھی ہے لکھنؤ جس کے لیے رطب اللساں — ڈھونڈتا ہے پھر علی گڑھ جسکے قدموں کے نشاں

علم و حکمت، فکر و فن میں اس کا ہمسر کون تھا
دوسرا بحر فصاحت کا شناور کون تھا

اس کو حاصل تھا نہایت زود گوئی میں کمال — شاعر بے مثل تھا اس کی نہیں کوئی مثال
اس کی نظمیں لاجواب اسکے قصائد لازوال — اس کی پرواز تخیل تک پہنچنا ہے محال

پھوٹتی رہتی ہیں کرنیں تابش افکار سے
دل پگھل جاتا ہے اس کی گرمی اشعار سے

مطبوعات جدیدہ

۱۔ تاجیکی ادبیات کے بانی ۲۔ جدید تاجیکی شعراء: از پروفیسر کبیر احمد جائسی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت، معیاری صفحات (۱) ۱۹۶ (۲) ۲۰۴ قیمت ۶۰ روپیے، دوسری کتاب کی قیمت درج نہیں، پتہ: کبیر احمد جائسی، نغاز پور ہاؤس، سر سید نگر علی گڑھ اور ببلی کیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ریاست تاجیکستان پہلے مغربی ایران کا حصہ تھی، سوویت یونین میں اسکے انضمام کے بعد سیاسی نظریاتی اور تہذیبی انقلاب کے ساتھ تاجیکی زبان میں بھی بڑا تغیر واقع ہوا لیکن اس میں کثرت سے روسی الفاظ کی شمولیت اور فارسی سے اسکے رسم الخط کے اختلاف کے باوجود اس کا ادب بھی فارسی ادبیات ہی کا ایک حصہ شمار کیا جاتا ہے، اردو میں ادبیات ایران پر برابر کام ہوتا رہا ہے لیکن تاجیکستان کے ادب سے اردو خواں طبقہ کو روشناس کرنے کا فریضہ جناب کبیر احمد جائسی انجام دے رہے ہیں، کئی برس پہلے انھوں نے ایک مستشرق یرژی بیچکا کی ہسٹری آف پرشین لٹریچر کے ایک باب کا ترجمہ تاریخ ادبیات تاجیکستان کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا تھا، بعد میں اس موضوع پر ان کی اور تحریریں بھی آئیں، اب زیر نظر دونوں کتابیں بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، اول الذکر کتاب میں انھوں نے تاجیکی ادبیات کے دو ممتاز ترین نمائندوں صدر الدین عینی اور ابوالقاسم لاہوتی کے

سوانح اور ان کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیا ہے، ان دونوں کا تعلق، روسی اشتراکیت
کے عہد آغاز و عروج سے ہے اس لیے ان کے سوانحی مرقع سے اس دور کی معاشرتی
اور تہذیبی تصویر سامنے آجاتی ہے، اس میں محنت کشوں، مزدوروں، امیر
بخارا کے مظالم، ملاؤں، مدرسوں، رجعت پسندوں کا ذکر جس انداز میں کیا گیا
ہے اس سے اشتراکیت اور ترقی پسندی کے مخصوص پروپیگنڈہ کا پتہ چلتا ہے
لیکن موجودہ نظریاتی تبدیلیوں اور اشتراکیت کی شکست و پسپائی کے بعد اب
ان کی معنویت ختم ہوچکی ہے، فاضل مولف کو عینی کا زیادہ کلام دستیاب نہ ہوسکا
اس لیے انھوں نے ان کی شاعری پر کسی حتمی فیصلہ سے گریز کیا ہے، البتہ لاہوتی
کے اشعار کے زیادہ حصے کو انھوں نے بڑے سلیقہ اور حسن ذوق سے پیش کیا ہے
ان دونوں کے کلام سے تاجیکی شاعری کے رنگ و مزاج اور اس کے رجحانات
کا اندازہ ہوتا ہے، پس منظر کے عنوان سے تاجکستان کے تاریخی و جغرافیائی
معلومات بھی دیے گئے ہیں۔ دوسری کتاب میں چھ مزید تاجیکی شعرا میرزا تورسون
زادہ، میرسید میرشکر، حبیب یوسف سمرقندی، عبدالسلام دیہاتی، محی الدین
امین زادہ اور باقی رحیم زادہ کی ادبی و فنی کاوشوں کا جائزہ ہے، ان تمام شعرا
کی نشوونما انقلاب بخارا (۱۹۲۰ء) کے بعد ہوئی، ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت
یہ ہے کہ شعری و ادبی پروپیگنڈہ کے اس دور میں بھی انھوں نے نئے موضوعات
سے روشناس کرانے میں قدیم شعری محاسن و روایات کو یکسر ترک نہیں کیا۔
لائق مصنف کو ان شاعروں کا مکمل کلام حاصل نہ ہوسکا، تاہم جہاں تک ان کی
رسائی ہوئی انھوں نے غائر مطالعہ کے بعد ان کی ادبی و فنی قدر و قیمت کو انصاف

کے ساتھ متعین کرنے کی کوشش کی، عالمی ادبیات کے قدرشناسوں کے لیے یہ
دونوں کتابیں لائق مطالعہ ہیں، البتہ مولف کی بعض باتیں محل نظر ہیں مثلاً ۲۰ء
کے بعد کی نسل کے متعلق مطلق طور پر یہ کہنا کہ "اس نسل کو لینن سے جو لگاؤ تھا وہ
حاکم و محکوم کا لگاؤ نہ تھا بلکہ محب و حبیب والا لگاؤ تھا۔"

جواہر آزاد: مرتبین جناب عبدالقوی دسنوی اور جناب محمد نعمان،
متوسط تقطیع، بہتر طباعت و کتابت، صفحات ۲۸۵، قیمت درج نہیں، پتہ:
سیفیہ آرٹس کامرس اور لا کالج، احمد آباد بھوپال۔

بھوپال کے سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو اپنی نمایاں تعلیمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے
ممتاز و نیک نام ہے، خاص طور سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی رہنمائی میں اس
شعبہ نے غالب و اقبال پر کئی مفید و وقیع مطبوعات پیش کرکے اہل نظر سے داد پائی
ہے، اب پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ان دونوں
ناموروں کی یاد میں زیر نظر کتاب شایع ہوئی ہے، حصہ نثر میں دوسرے اہل قلم
کے علاوہ مالک رام، علی سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، ابن فرید اور پروفیسر
عبدالقوی دسنوی کے مضامین اس کی زینت میں اضافہ کرتے ہیں، مولانا ضیاء الدین
اصلاحی ناظم دارالمصنفین کا مضمون 'صفات الٰہی کا قرآنی تصور' اور مولانا ابوالکلام آزاد'
بھی اس میں شامل ہے، مولانا آزاد اور بھوپال کے متعلق قاضی وجدی الحسینی مرحوم، حکیم
سید ظل الرحمٰن اور محمد نعمان کے مضامین میں بعض دلچسپ معلومات ہیں، تذکرہ میں
مولانا آزاد نے بھوپال سے متعلق جو روایتیں بیان کی ہیں، ان مضامین سے ان کا قطعی
رد ہوتا ہے، جناب نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد ۴۷ء میں آزادی

ملنے پر پارٹی لیڈر ہو سکتے تھے لیکن اپنے ذوق کی رعایت سے انھوں نے وزارت تعلیم کو ترجیح دی، بہتر ہوتا کہ اس خیال کی تائید میں کوئی مضبوط دلیل بھی سپرد قلم کر دی جاتی، ڈاکٹر سید حامد حسین کا مضمون، پنڈت نہرو اور مسلم تاریخ کی ترجمانی، بھی عمدہ ہے، حصہ نظم میں تنوع ہے، علامہ شبلیؒ کے اشعار میں ایک مصرعہ ع یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک، میں سہو کتابت نے حشر انگیزیاں کر کے اور ستم ڈھایا ہے۔

تفہیم المنطق: از ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، کاغذ کتابت طباعت اعلیٰ درجہ کی، صفحات ۳۰۰، قیمت پیپر بیک ۷۵ روپیے، مجلد ۹۵ روپیے، پتہ: ۱۔ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ۲۔ دفتر ذکر و فکر جی/۱، ۱۲۷۸ اوکھلا، جامعہ نگر دہلی ۲۵۔

مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم اور خاص طور پر درس نظامی میں منطق ایک زمانہ سے اہم اور ناگزیر فن کی حیثیت سے شامل و رائج ہے، علوم اسلامی میں علم کلام کی مانند یونانی منطق کا عمل دخل، بلاغت، اصول فقہ اور تفسیر وغیرہ میں راسخ رہا لیکن دور جدید میں معقولات کے بعض اور علوم کی طرح منطق کی ضرورت و اہمیت میں بتدریج کمی آتی گئی تاہم اسلاف کے قدیم علمی ورثہ کو سمجھنے کے لیے اس فن سے بالکلیہ صرف نظر بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس فن کے طلبہ خصوصاً مبتدیوں کے لیے جدید طرز و انداز اور آسان و سلیس زبان میں ایسی کتاب مرتب کیے جانے کی ضرورت تھی جس کو سمجھنے میں انہیں مشکل اور دشواری نہ ہو، ندوۃ العلماء نے صرف و نحو اور ادب و انشاء میں اس طرز کی متعدد مفید کتابیں شایع کی ہیں جو اکثر مدارس کے

نصاب میں داخل ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ میں ایک نیا اضافہ ہے، جس میں فاضل مرتب نے اس فن کی مصطلحات کو بڑی شگفتگی اور سلاست سے پیش کیا ہے، مثالوں میں عربی کے علاوہ اردو کے اعلیٰ درجہ کے اشعار کے انتخاب نے سنگلاخ زمین پر خوش رنگ چمن کی رونق پیدا کر دی ہے انھوں نے طلبہ کے ادبی ذوق کی آبیاری کی شعوری کوشش بھی کی ہے، کلیات خمسہ میں "ذوالفقار علی خاں کی موٹر" ایسی ہی ایک مثال ہے، قیاس استثنائی کے باب میں "اگر شورش خاں الکشن میں کھڑے ہو گئے تو فساد یقینی ہے" کی مثال سے طالب علم کے ذہن میں طنز و مزاح کی پھوار سے نرمی و تازگی لانے کی کوشش ہے، بعض حکیم بزرگوں کے ملفوظات اور دلچسپ واقعات بیان کر کے مدعا کی توضیح کے ساتھ بصیرت کا سامان بھی فراہم کیا گیا ہے، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے پیش لفظ میں تحصیل علم کے ذرایع، عرب و یونان کا فرق، مسلمانوں کی یونانی منطق و فلسفہ سے دلچسپی، اس میں ان کی خدمات و امتیازات، دوسرے فنون پر اس کا اثر، ہندوستان میں اس فن کا عروج، ندوۃ العلماء اور فن منطق پر مفید اور معلومات افزا گفتگو کی گئی ہے، کتاب نہایت مفید و نافع ہے اور عربی و دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

اقبال فکر و فن: از ڈاکٹر سید محمد ہاشم، تقطیع متوسط، صفحات ۳۲۵، کاغذ کتابت طباعت مناسب، قیمت ۶۰ روپے۔ پتے: مکتبہ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام اور فکر و فلسفہ سے اردو زبان کا دامن اس قدر مالامال ہے کہ اب شاید اس کو تنگیٔ داماں کا مرحلہ درپیش ہے، تاہم مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے ان کے کلام کے مطالعہ و تجزیہ کا عمل مسلسل جاری ہے، زیر نظر کتاب میں 'بانگ درا' اور 'بال جبریل' کی نظموں سید کی لوح تربت، شکوہ و جواب شکوہ' مسجد قرطبہ، لینن خدا کے حضور میں' فرشتوں کا گیت، فرمان خدا، ذوق و شوق' جبرئیل و ابلیس اور شعاع امید جیسی منتخب نظموں کی روشنی میں علامہ اقبال کے فکر و فن کے باہمی امتزاج اور ان کے فلسفہ و فن کو سمجھانے اور ان کا معیار متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، شروع میں اقبال کی اردو اور فارسی غزل سرائی پر بھی عمدہ بحث ہے، مگر ادائے مطلب میں بعض جگہ ژولیدگی ہے مثلاً "یہی ان کا متحرک شعری رویہ ہیں" نظموں میں بھی ایجاز اپنے تفصیلی اعجاز کا اظہار کرتا ہے" حالی نے انقلابی طور پر نہیں بلکہ بتدریج غزل کے فن اور موضوع کو نیا موڑ دیا... الخ" یہ پوری عبارت گنجلک نظر آتی ہے، کہیں خطیبانہ اور ادعائی انداز بھی پیدا ہوگیا ہے جیسے "خودی کو وہ معنی عطا کیے..... اس سے وہ کام لیے جو دارا و سکندر اور جمشید و پرویز کے لیے ممکن نہ ہو سکے" "حافظ کے طرز کو اختیار کرنے پر وہ مجبور تھے" شکوہ و جواب شکوہ کے متعلق ایک جگہ لکھا گیا کہ "نظم میں مقصدیت کا غلبہ ہے یہ اس کی خامی ہے اور مکالمے کے معیار کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ بات فن کی ناپختگی' راہ ترسیل کی خامی اور مشاقیت کی نفی کی دلیل بن گئی ہے" لیکن آگے یہ بھی اعتراف ہے کہ " اس نظم نے فرحت، مسرت اور بصیرت عطا کی ہے" سوانح اقبال کا ایک خاکہ بھی

رسالہ نقوش کے اقبال نمبر کی مدد سے دیا گیا ہے اور آخر میں کتاب کی موضوع بحث نظموں کو بھی نقل کیا گیا ہے۔

تمباکو، زہر قاتل: از جناب عبدالرحمٰن کوندو، صفحات ۹۶ قیمت ۲۰ روپیے، ملک کے مشہور مکتبوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

جناب عبدالرحمٰن کوندو، معاشرہ کی مروجہ بے اعتدالیوں اور برائیوں کے قلع قمع کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اس سے پہلے انھوں نے جہیز کی بدعات کے خلاف 'فتنہ جہیز' کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی، اب تمباکو نوشی جیسی مضر صحت اور مسرفانہ عادت کے اثرات بد سے خبردار کرنے کے لیے یہ رسالہ مرتب کیا ہے اس میں تمباکو کے شرعی حکم، طبی نقصانات اور سماجی برائی پر علماء و اہل قلم کی مفید تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے، میاں سید نذیر حسین دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری کے فتاویٰ بھی شامل ہیں، تمہید و تقدیم کے عنوان سے خود کوندو صاحب کا سیر حاصل مضمون بھی ہے۔

شراب' ایک زہر قاتل: از مفتی عبدالقادر بستوی، قیمت ۱۰ روپیے پتہ: رشید بک ڈپو، گورینی، کھیتاسرائے، جونپور یوپی۔

اس میں مذہبی، اخلاقی اور تجرباتی حیثیت سے شراب کی شناعت و قباحت دکھا کر اس سے حذر و اجتناب کی دعوت دی گئی ہے۔

وطن سے وطن تک: از جناب سید ابوالخیر کشفی، ۸۰ صفحات قیمت ۱۸ روپئے پتہ مجلس مطبوعات و تحقیقات اردو، جامعہ نگر، جامعہ کراچی پاکستان۔

سفر حج کی مختصر مگر نہایت پُراثر داستان نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نذرانہ نعت بھی ہے۔

بادۂ حجاز : از مولانا بدر القادری، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۲ روپئے، پتہ: المجمع الاسلامی، فیض العلوم، محمد آباد، اعظم گڈھ۔

ایک اور مبارک نعتیہ مجموعہ، حمد و منقبت اور سلام بھی شامل ہے۔

صبح حرم، شام حرم، غبار حرم، گنبد خضراء، درود و سلام کیمیائے آزاد، ایک مخلصانہ پیغام
از مولانا عبد اللہ بستوی
قیمت تین تین روپئے، پتہ: قاسمی پبلشنگ کمپنی، محلہ قاسمیہ (آزاد نگر ۲) کوٹل بہار، بستی، یوپی۔

ایک قدم اور سہی : از اختر انصاری مرحوم، صفحات ۱۰۰، قیمت ۲۴ روپئے، پتہ: مکتبہ جامعہ علی گڑھ
دبان زخم کے بعد کی غزلوں، رباعیوں اور نظموں کو شمس بدایونی نے مرتب کیا، ڈاکٹر وحید اختر کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

تلوک چند محروم : از جناب رام لعل نابھوی، صفحات ۷۶، قیمت پانچ روپیے،
پتہ: رویندر بھون ۳۵- فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی۔

استاد اور نکتہ ور شاعر تلوک چند محروم کے سوانح اور کلام پر مختصر و جامع کتاب ہے۔

احمد شوقی ایک مطالعہ : از جناب محمد اظہر حیات، صفحات ۹۶، قیمت ۲۰ روپیے
پتہ: حیات بک ڈپو مومن پورہ، ناگپور۔

جدید عربی دور کے مصری شاعر کے کلام و سوانح کا ذکر ہے،

متاع حیات : از پروفیسر عبد القوی دسنوی، صفحات ۴۰، قیمت درج نہیں،
پتہ: سیفیہ کالج، احمد آباد، بھوپال،

مولف کے مختصر خود نوشت سوانح۔

ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات : از بی این پانڈے، قیمت پانچ روپیے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی مسائل : قیمت درج نہیں، پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔

(ع۔ص)

سلسلہ سیر الصحابہ

حصۂ اول (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی : اس میں خلفائے راشدین کے
اتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابرین
تم و قریش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے ۴۵/-

حصۂ سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی : اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے
حالات و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری : اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں
کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/-

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری : اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل
درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی : اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ
حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعۂ
ربلا درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی، اس میں ان صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جو
فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/-

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات
اور عام صحابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/-

حصۂ نہم (اسوۂ صحابۂ اول) عبد السلام ندوی : اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات،
اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دہم (اسوۂ صحابۂ دوم) عبد السلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور
علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/-

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبد السلام ندوی : اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور
علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ۱۵/-